ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد : ۵ ـــــــــــــــــــ شمارہ ۷

جولائی ۱۹۹۰ء

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون :	۴۰ روپیے
خصوصی تعاون :	۱۰۰ روپیے
غیر ممالک سے :	۲۰ امریکی ڈالر
فی شمارہ :	۴ روپیے

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترسیل زر کا پتہ : دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریاگنج، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس برائے جال پریس دہلی

نقوشِ حیاتِ نو

★ اداریہ

نصابِ تعلیم پر نظرِ ثانی کی ضرورت — محمد اسمٰعیل فلاحی — ٣

★ بحث و نظر

جاہلی شاعری کا مطالعہ — محب الحق قاسمی — ۷

اپنے دل کی دنیا میں جھانکیں — نسیم صدیقی — ۹

پاکستان میں دینی تعلیم — مولانا امین احسن اصلاحی — ۲۷

ابن حزم: حیات اور شاعری — محمد حسن حبیب فلاحی — ۴۷

ہماری شادیاں — عبدالمجید فیضی بستوی — ۵۵

انسان جوابدہ کیوں؟ — عبدالبر اثری فلاحی — ۳۰

لازمی نکاح رجسٹریشن بل مسلمانوں کیلئے قابلِ قبول نہیں — مولانا منت اللہ رحمانی — ۹۳

جامعہ کے لیل و نہار

جمعیت طلبہ کا انتخاب — محمد اسمٰعیل فلاحی — ۹۱

مولوی محمد ادریس صاحب کا انتقال

نصابِ تعلیم پر نظرِ ثانی کی ضرورت

لوگ حیرت اور حسرت سے یہ سوال کرتے ہیں وہ مدارس جن کا ایک روشن اور تابناک ماضی ہے جو ہر سیلابِ بلا اور طوفانِ تیز و تند کے آگے سدِّ سکندری بنے پہاڑ کی طرح جمے رہے، کیا بات ہے کہ آج ان مدارس نے پھل دینا بند کر دیا ہے اب ان سے وہ سرفروش و جانباز نہیں نکلتے جن سے کفر کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے اور باطل کے دل جن سے دہل جائیں، جو جذبۂ توحید سے سرشار اور حبِّ رسول میں مست آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور جن سے آنکھیں ملانا باطل کے اندر جھرجھری اور کپکپی پیدا کر دے؟

میں سمجھتا ہوں اس کے اسباب میں ایک خاص سبب نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی خامی ہے۔ کسی بھی مدرسے کا نصابِ تعلیم اس کے پیشِ نظر مقصد کے مطابق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پیشِ نظر کیا مقصد ہے، وہ کون سی منزل ہے جہاں ہم اپنے طلبہ کو لے جانا چاہتے ہیں؟ صرف نماز روزہ اور وراثت وغیرہ کے احکام و مسائل جاننے والے افراد تیار کرنا ہمارے سامنے ہے۔ تو مدارس یہ خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن اگر اس سے آگے بڑھ کر دنیا کی امامت و رہنمائی، جدید دنیا کے جدید مسائل کو حل کرنا، ابولہب اور ابوجہل کی نت نئی صورتوں اور نئے نئے قالبوں سے آگاہ ہونا، ان سے لوہا لینا اور اسلام کو اس دور کے واحد

دین کی حیثیت سے پیش کرنا پیشِ نظر ہے تو مروجہ نصاب اس کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔

مولانا آزاد نے بہت پہلے کہا تھا۔

"یہی عربی و فارسی کی تعلیم تھی، اس تعلیم میں اور وقت میں رشتہ تھا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جو لوگ پیدا ہوتے تھے زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا۔ بہرطور وہ زمانہ گذر گیا۔ زمانہ تو اپنی تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا اور آپ وہیں بیٹھے رہے۔ جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا، اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی، زمانہ بھی چلتا رہا، وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے۔ اور آپ وہیں کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں۔ آپ وقت کی چال سے کیسے جوڑ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ میں اور زمانہ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہو گئی ہے اور وہ تعلیم کہ جس سے ملک کے بہترین مدبر، ملک کے بہترین منتظم اور ملک کے بہترین عہدہ دار پیدا ہوتے تھے۔ آج انھیں مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ لوگ بالکل نکمے ہیں۔ ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر یہ لوگ بس خیرات کی روٹیاں توڑ لیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے"۔

(خطبات آزاد ص ۳۳۰)

مولانا آزاد کی بات صد فیصد درست ہے کہ ہمارے مدارس میں صدیوں پرانا نصاب چل رہا ہے۔ یہ جب بنا تھا اس وقت کے حالات اور ضرورتوں کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل گئے، تقاضے بدل گئے اور ہم اس نصاب پر اصرار کئے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن و حدیث دائمی اور ابدی ہیں۔ ان کے علاوہ جو کچھ اس نصاب میں ہے، وہ خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ گذرے وقت کی ضرورت تھی اور آج کے بدلتے

حالات اور تقاضوں کا تقاضہ کچھ اور ہے۔ یہ منطق، یہ فلسفۂ قدیم دورِ رفتہ کی یادیں ہیں انھیں بحفاظت کسی میوزیم میں رکھ دینا چاہئے۔ یہ فارسی جو عربی دینی نصاب کے لئے ایک لازمہ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ اس وقت کے لئے تو ٹھیک تھی، جب فارسی ہماری زبان تھی، فارسی کا دور گذرے ایک زمانہ بیت گیا۔ یہ نہ ہماری دینی زبان ہے اور نہ ہماری دفتری زبان، ان علوم کی جگہ کیا نصاب میں جدید تقاضوں کو نہیں سمویا جا سکتا اور ہندی، انگریزی اور دوسرے عمرانی علوم نہیں پڑھائے جا سکتے؟

پھر ہمارے مدارس میں کسی مخصوص فقہ کو حد سے زیادہ اہمیت دے دینا اور اسے قرآن و حدیث کے تابع رکھنے کے بجائے، قرآن و حدیث کو اس کے گرد گھمانا اور تاویلیں کرنا، ہمارے مروجہ نصاب اور طریقہ تعلیم کا امتیاز ہے۔ عقیدہ کچھ بھی ہو لیکن عملاً قرآن و حدیث کے بجائے کوئی نہ کوئی مخصوص فقہی مسلک ہماری بنیاد ہے، اور اس فقہ کی تعلیم کے لئے بھی مروجہ کتابیں آج کوئی بہت زیادہ سود مند نہیں ہیں، یہ کتابیں اگلے وقتوں کی مجبوری اور ضرورت تھی، اس میں بہتیرے ایسے مسائل ہیں جن کو سن کر اور پڑھ کر ہنسی آتی ہے خود کتابیں زبانِ حال سے اعلان کر رہی ہیں کہ نصاب کے لئے انھیں مدون نہیں کیا گیا تھا۔ نصابی کتابوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، ہدایہ ہو کہ بدایہ، کسی میں بھی طالب علم کی نفسیات اور نصابی کتابوں کے تقاضے ملحوظ نہیں رکھے گئے ہیں۔ اب جبکہ یونیورسٹیوں اور جامعات کے لئے نصاب تیار ہو چکا ہے اس سے استفادہ کرنا گناہ کی بات نہیں ہے۔

جہاں تک قرآن و حدیث کے پڑھنے پڑھانے کا سوال ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ انتہائی مظلوم کتابیں ہیں، قرآن ہم کو سیدھے قرآن پڑھانے کے بجائے اس کی تفسیر کی کوئی مخصوص کتاب اس طرح پڑھائی جاتی ہے جیسے کہ وہ بھی قرآن ہی کی طرح الہامی ہو، ہمارے بزرگوں نے قرآن کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلا شبہ ان کی مساعی آب زر سے

لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہم ان تمام بزرگوں سے استفادہ کرتے ہیں اور سب کی تفسیروں سے خوشہ چینی کرتے ہیں لیکن مخصوص طور سے کسی خاص تفسیر اور اس کی تاویلات پر اصرار، قرآن کے بجائے حقیقتاً اس کتاب کو پڑھانا ہوا اور امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن اس معنی میں ہمارے یہاں سب سے مظلوم کتاب ہے۔ اگر ہم اس قرآن کو بنیاد اور اصل بنا کر تعلیم دیتے تو ہمارے طلبہ کے اندر فقہی موشگافیوں اور گروہی تعصب کے بجائے، قلب و نظر میں وسعت پیدا ہوتی اور مسلکی اکھاڑوں کے بجائے اخوت و محبت کی مسرور آگیں اور روح پرور فضا قائم ہوتی اور ایک دوسرے کو غیر سمجھنے کے بجائے سب کو ہم ایک کنبے کا فرد سمجھتے اور ایک دوسرے کے علم اور اس کی کوششوں سے استفادہ کرتے۔

عربی زبان پڑھانے کا طریقہ بھی ہمارے مدارس میں ایسا جان لیوا اور صبر آزما ہے کہ لوگ ہمت ہار جاتے ہیں۔ مردہ زبان کی طرح یہ زبان پڑھائی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ زندہ، ترقی یافتہ، آفاقی اور دائمی زبان ہے، طریقہ تعلیم اور منہج تعلیم میں بھی کافی ترقی ہو چکی ہے، جس سے ایک دنیا استفادہ کر رہی ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسی گھسے پٹے پامال راستے پر چل رہے ہیں۔

ان باتوں کو ملحوظ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طالب علم سات سال، دس سال کسی درس گاہ میں گذار کر آتا ہے، اسے عصری علوم تو درکنار قرآن و حدیث میں بھی گہری بصیرت و آگاہی نہیں ہوتی۔ عربی کے دو چار جملے لکھنا اور بولنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ ہاں مخصوص مسائل پر [illegible] ہوتی اور [illegible] ہوئی ضرور نظر آئیں گی لیکن اس سے الگ ہٹ کر زندگی کے عام مسائل میں وہ اپنے کو عاجز و درماندہ، کمزور اور بے بس پائے گا۔ احساس کمتری کا شکار اور مرعوبیت کی تصویر ہوگا۔

اس احساس کمتری اور مرعوبیت کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ زمانے میں جو علوم فنون رائج ہوتے ہیں، وقت جن کی مانگ کرتا ہے اور لوگوں کے اندر جن کی پیاس ہوتی ہے، یہ ان سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ کسی مجلس میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لوگ گفتگو کریں گے اور یہ خاموش بیٹھے رہیں گے اور اگر حصہ بھی لیا تو اس سے اس طرح ان کی بے ذوقی اور لاعلمیت مزید واضح ہوتی چلی جائے گی۔ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جن مراکز علم و آگہی سے وہ آتے ہیں ان میں پانچ سو سالہ پرانا نصاب تعلیم پڑھایا جاتا ہے، جسے اس وقت کے حالات اور ضرورت کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا، جس میں اس عہد رفتہ کے مسائل اور اس وقت کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ نصاب خود زبانِ حال سے شہادت دیتا ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ اس میں وقت کی ضرورت کا کتنا لحاظ رکھا گیا تھا اور آج بھی اس نصاب کے "تابوت" کو ڈھوئے جانا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں کی دانشمندی اور کس کتاب و سنت کا تقاضا ہے۔ اس نصاب کا صرف یہی نقص نہیں ہے کہ یہ یک رُخا ہے بلکہ اس میں علوم قدیمہ کا جو حصہ ہے وہ بھی بہت سی غیر ضروری چیزوں سے بھرا ہوا اور بہت سی ضروری چیزوں سے خالی ہے۔ جن مدارس نے اس جانب توجہ بھی دی، وہ بھی کوئی بہت زیادہ مفید اور نتیجہ خیز خدمت انجام نہیں دے سکے۔ اس لئے کہ کسی ایک فرد یا ایک مدرسے کے بس کی بات نہیں۔ نصاب کی از سر نو تدوین ہی کے لئے، ایک کیا، متعدد اداروں کو متحد ہونا پڑے گا۔

اگر ان پہلوؤں پر، خصوصاً قرآن کی تعلیم کے سلسلے میں مندرجہ بالا گذارشات پر توجہ دی گئی ہوتی تو ہم اپنے اسی قریب کی جن شخصیتوں کو ستاروں کے مانند چمکتا اور دمکتا دیکھتے ہیں، یقیناً وہ امام احمد بن حنبل اور ابن تیمیہ سے کم اور ان سے پیچھے نہیں ہوتے۔

ہمارے اپنے افراد کے ہاتھوں دو طرح کے مدارس چل رہے ہیں، ایک خالص دینی مدارس جہاں عصری علوم شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے خالص عصری مدارس جن میں دینی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، ان

دونوں طرح کے مدارس کے لئے الگ الگ نصاب کی ضرورت ہے۔ خالص دینی مدارس کے لئے ایسا نصاب جس میں عصری علوم کو متناسب نمائندگی دی گئی ہو اور خالص عصری مدارس کے لئے ایسا نصاب جس میں معقول انداز میں دینی علوم کو ان کا مقام دیا گیا ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس اور ان کے ذمہ داران سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس کوچے کی سیاحی میں عمریں گذار دینے والے ماہرین اساتذہ کے مشوروں کی روشنی میں معتدل، متوازن اور جدید تقاضوں کے مطابق ایک نیا نصابِ تعلیم مرتب کریں۔ تب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ان مدارس سے پتھر مارنے کی مشین کے بجائے دوبارہ طیارہ شکن اور میزائل مار توپیں تیار ہوں گی جن سے باطل لرزہ براندام ہوگا، اس کی فلک بوس عمارت زمین بوس ہوگی اور اسلام اس دور کا دین بنے گا۔ انشاءاللہ۔

بقیہ: جاہلی شاعری کا مطالعہ

کلثوم، المرقش الاکبر اور عنترہ بن شداد العبسی کا زیادہ حصہ ہے۔

وصف

کسی چیز یا جگہ کی سراپا تصویر کشی جاہلی شاعری کی مشہور اصناف میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کو جن چیزوں سے زیادہ واسطہ رہا یا ان کی زندگیوں اور تجربات میں وہ چیزیں کثرت سے آئیں، ان کی تصویر کشی میں انھوں نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جاندار اور غیر جاندار کی کوئی قید نہیں، چنانچہ جہاں اونٹ، گھوڑے کا ذکر ملتا ہے وہیں چاند، سورج، بجلی، بارش، جنگل، پہاڑ، محبوب کی گذرگاہیں اور ٹیلوں کا بھی تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں عورتوں کے مختلف حصۂ جسم اور جلوۂ حسن کی تصویر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ اس کا پورا وجود اپنی تمام تر دل فریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔

(جاری)

اپنے دل کی دنیا میں جھانکیں

(از: نعیمہ صدیقی)

کیا ہم کبھی خارج کی دنیا سے الگ اور جسم کے تقاضوں سے بے تعلق ہو کر بھی اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اترنے کا موقع پاتے ہیں؟ ہمارے گرد و پیش کے ہنگامے اتنے بڑھ گئے ہیں اور زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ نظر کہیں ٹھہرنے نہیں پاتی۔ ہم بہت سے مشغلے اور دلچسپیاں رکھتے ہیں صرف اپنے سے ہی دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ خارج کے احوال سے تعلق اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ داخل کا مکان مقفل پڑا رہتا ہے۔ دوسروں ہی کے ساتھ اتنے جھمیلے ہیں کہ اپنے ہی سے کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ ساری دنیا کی اصلاح کا ذمہ ہم لے لیتے ہیں مگر اپنی روح ہی کی بگڑی نہیں بنا سکتے۔

جہانِ دل کی سیر

کیا آپ کو صحیح صحیح اندازہ ہے کہ ہمارے دل کا کیا عالم ہے؟ اس میں کتنا کوڑا کرکٹ جمع ہے کیسی کیسی شاندار غلاظتوں کے ڈھیر جگہ جگہ لگے ہیں؟ مردوں کی

ہڈیاں اور سڑے ہوئے گوشت جیسی بساند بھری ہے۔ مکڑوں نے جالے تن رکھے ہیں۔ خونخوار چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ باطنی فضا میں سنائی دیتی ہے ناگ پھنکارتے ہیں، الّوؤں کی ہیبت آوازیں گونجتی ہیں۔ طرح طرح کے بُت جگہ جگہ نصب ہیں۔ دیواروں پر منحوس عریاں تصویریں نقش ہیں۔

اپنے باطن کی اس ناپاک دنیا کو دلفریب گفتگوؤں اور لچھے دار تقریروں سے چھپاتے ہیں، ان کو لطیفوں اور قہقہوں سے ڈھانپتے ہیں، ان کو مصنوعی سنجیدگی و وقار کے پردوں سے سجاتے ہیں، دولت کے انباروں، عیش کے سامانوں، خوبصورت بنگلوں، لطیف فنی شاہ پاروں، پربہار سماجی اور ثقافتی تقریبوں میں نگاہوں کو الجھا کر آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ دوسروں کی نگاہوں سے چھپا چھپانا تو الگ رہا، ہم اپنی ہی نگاہوں کو اپنے دلوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اپنے باطن پر نگاہ ڈالنے کے لیے ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہماری مصروفیات بے پناہ اور ہمارے عہدے بڑے اونچے ہیں۔

دل کا دروازہ کھولیے !!

پھر کیا آپ ایسا محسوس کرتے ہیں؟ اگر آپ کو یہ مبارک احساس ہے تو دل کا مقفل دروازہ کھولیے اور اس کے اندر گرد سے اَٹی ہوئی سیڑھیوں سے تاریکی ہی کے عالم میں اتر جائیے اور اگر کہیں کوئی روشنی ہو تو بہتر، ورنہ ہاتھ پیروں سے ٹٹول کر دیکھیے کہ اس میں کیا کیا کچھ ہے۔ کانوں سے کوئی آواز سنائی دے تو اسے سنیے کہ کیا آواز ہے اور کیسی؟ خوش نصیب ہیں وہ جو روزانہ ایک آدھ مرتبہ اپنے ایوانِ دل کا چکر لگا لیتے ہیں، پھر وہ بھی برے نہیں جو کبھی کبھار کوچۂ دل کی گردش کرتے رہتے ہیں، جن کو سرے سے یہ توفیق ہوتی ہی نہیں، ان کو قیامت کے دن خبر ہوگی کہ نجات نہ مال و جاہ پر منحصر ہے، نہ بیوی بچوں اور قرابت داروں پر، نہ مرغوب کن

لباسوں پر، نہ پلے ہوئے آراستہ جسموں پر۔ وہاں تو معاملہ دوسرا ہے۔ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔

نجات اور کامرانی صرف ان کے لئے ہے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں۔ آج ہمارے سوچنے کا سوال یہ ہے کہ آیا قلبِ سلیم کی دولت ہمارے پاس ہے؟ سلامتی والا دل، حق شناس دل، راست باز دل، ہمارے سینوں میں ہے۔؟

اگر یہ نہیں تو پھر سارے ظاہری ہنگامے اور سرگرمیاں اور بڑے بڑے مناصب اور مشغلے، حسنِ گفتار اور جوشِ اظہار، اختیارِ حکم اور اطاعت طلبی، بڑے بڑے اصحاب کی ہم نشینی، بڑے بڑے کاروبار چلانے کی اسکیمیں، راحت کے اسباب سے گھرا ہوا گھر سب کچھ بیکار ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے ۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جینے سے تو ہم نے یہ کبھی دیکھا ہی نہیں کہ پہلو میں دل زندہ ہے یا نہیں؟ آیا وہاں سل یا سوکھے کا کوئی لاعلاج مریض پڑا ہے یا دل کی بجائے دل کی میت پڑی ہے اور وہ سڑ بگڑ رہی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ آپ کی ساری کمائی اور سارا خزانہ یہی کچھ ہے۔ آپ نے اگر اسے گلشن بنایا ہے تو قیامت کو سامنے آجائے گا اور اگر گلخن بنایا ہے تو یہی آپ کو محل سرائے ہوگی۔

خرابیٔ دل کے اسباب

دل کی تباہی چند چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ طرح طرح کی جسمانی خواہشات اس کے گرد محاصرہ کرلیں اور ساری توجہ دولت اور اسباب اور کاروبار کی طرف منعطف ہوجائے اس طرح دل کی گرد

کئی خول چڑھ جاتے ہیں جو اسے بھینچ کر اور اپنے پنجے میں جکڑ کر آہستہ آہستہ مرگ دل کا سامان کرتے ہیں۔ یہی معنی ہیں: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ اور دوسرے ارشاد قرآنی کے۔ اور یہی مفہوم ہے ان احادیث رسالت کا، مغز یہ ہے کہ کفاف کی گذران بہترین معیشت ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جب دولت کی ریل پیل سے سابقہ پڑے گا تو حال یہ ہو جائے گا کہ

مسکین دلکم ماندہ دریں کش مکش اندر

اس دل پر آپ سونے چاندی کے انبار لاد دیں، اس پر بھاری عمارت کا بوجھ کھڑا کر دیں، اس پر نئے نئے اسباب تعیش کا بوجھ ٹھونس دیں، اس پر مفاد کے جھگڑوں کے بل چلا دیں اور یہ سمجھیں کہ یہ ہستی نازک محفوظ رہ جائے گی، یہ ایک بڑی خود فریبی ہے۔ دل پر بوجھ کم کیجئے۔ خواہشوں اور لذتوں کا بوجھ، کثرت اسباب و مسائل کا بوجھ، جھگڑوں اور جھمیلوں کا بوجھ، خیانت اور بیش دستی کا بوجھ۔

دل کی شامت انسانی معاملات و تعلقات کے دائرے میں آتی ہے۔ کسی طرف سے ذرا سی غفلت ہو گئی اور آپ کے اندر کینے کی میخ گڑ گئی۔ کسی سے نقصان یا رنج پہنچا یا کوئی شخص آپ کے مفاد کا آڑ کا رہ بنا تو اس سے نفرت ہو گئی۔ کسی کے متعلق آپ کی یہ سوچ کہ یہ شخص اپنی نیکی یا دیانت یا اپنی بے نیازیٔ مفاد کی وجہ سے میرے منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ ہے، لہٰذا اس سے نفرت ہو گئی۔ کسی نے حق بات کہہ دی تو آپ کو غصہ آگیا اور پھر وہ ایک مستقل تلخی بن گیا۔ کسی نے یہ دیکھا کہ کسی خاص مقام کو پانے میں فلاں کا وجود حائل ہے تو آپ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ کسی نہ کسی طرح اس رکاوٹ کو دور کرنا ہے اور اسے دور کرنے کے لئے آپ نے اس کے خلاف کیس تیار کرنا شروع کر دیا، نیز کسی دوسرے کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ کسی نے اختلاف کیا تو آپ نے محسوس کیا کہ توہین ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے دل میں اس کے لئے ایک مستقل تحقیر پیدا ہو گئی۔ کسی نے تنقید کا کوئی کلمہ کہہ دیا تو آپ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے ———

ع اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

پھر اس کے رد عمل میں شدید جھنجھلاہٹ، تندیٔ گفتار، اور اُسے یہ محسوس کرانا کہ ہماری نگاہ میں نہ تمہاری وقعت ہے، نہ تمہارے نقطۂ نظر کی کوئی قیمت، تم ایک جاہل کندۂ ناتراش اور مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہمارے سامنے بہت پست مقام پر ہو۔ کسی کے خلاف غیبت، کسی کے خلاف جتھہ بندی، کسی کے خلاف منصوبہ بندی، کسی کے خلاف نفسانیت کے وار، مگر ان کا پیرایہ اصولی۔

ایک اور مصیبت کبر کی، کبر علم اور کبر منصب اور کبر پارسائی اور کبر ذہانت، کبر قوت، کبر دولت، کبر زیرکی و چالاکی ... اور پھر کبر کے منارے پر کھڑے ہو کر دوسروں کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرنا کہ یہ سب بونے ہیں، چونٹیاں رینگ رہی ہیں، کوئی ہمسر نہیں، کوئی بھائی اور دوست نہیں۔

کوئی دیہاتی ہے تو اس کا وجود دیو کبر کے لئے بہترین غذا فراہم کرتا ہے، کوئی غریب ہے تو اس کی غربت ہمارے غبارۂ نفس کو پھلا دیتی ہے، کوئی ان پڑھ ہے تو ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے یہ بے چارہ تو محض کیڑا ہے۔

دل کی سلامتی ایمان باللہ اور خوف خدا سے ہے، مگر جب ساری توجہات معیار زندگی بڑھانے پر صرف ہو رہی ہوں اور ساری مساعی نت نئے کاروبار کی راہیں نکالنے میں کھپ جائیں۔ دماغ کی کاوشیں مختلف اسباب: قالین، صوفے، ٹیلی ویژن، وی سی آر، کپڑے دھونے کی مشینیں، اسے ہی جمع کرنے کے لئے وقف ہو جائیں اور جب خوب بجرشیلی اور ٹھاٹھ باٹھ کی تقریبیں ہونے لگیں تو ہمارے دل کا زندگی میں کیا مقام رہا۔ ستم یہ کہ یہ سارے کھیل دوسرے کھیلیں تو دنیا پرستی، اور ہم کھیلیں تو عین خدا پرستی اور خدمت دین، ہر غلط چیز پر خدا پرستی اور تقویٰ کا لبادہ زیب موجود!

دل کی آفات

جس دل کو یہ آفات درپیش ہوں کہ کسی سے کد اس سے کد کسی سے کینہ، کسی سے کھٹک،

کسی سے کھینچا تانی، کسی کے لئے نفرت و تحقیر، کسی کی کمزوری غذائے غرور، کسی کے خلاف غیبت، کسی کے خلاف بدگوئی اور محاذ آرائی، کسی سے ترک سلام، کسی سے رنج ہوا تو معاف کرنا حرام اور کسی کے لئے معافی دینے کا دروازہ بند، معافی دی بھی تو لفظوں میں دی مگر اخلاص سے نہیں دی، کسی سے سرمایہ حاصل کرنے کی خواہش، کسی کے یہاں سرمایہ لگانے کی بے چینی، کسی کی حصہ داری سے شکایت، کسی قرابت والے سے قطع رحمی، کسی ضرورت مند کے لئے ایثار ناپید، اجتماعی املاک کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا — غرضیکہ دل پر ہر طرف سیاہ نقطے مسلسل لگ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں اور وہ سیاہی کے غلاف میں اس طرح لپٹا جا رہا ہے کہ وہ جو دنیا بھر میں شمعیں جلاتے پھرتے ہیں ان کے اندر کا چراغ کشتہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ حق

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

جب اپنے باطن کا اصل عالم یہ ہو تو چہرے خوب تاباں ہوئے تو کیا۔ اندر سے اور بیج لہو بھرا ہو تو اس سے کیا فائدہ کہ ہاتھ پر بناوٹی طور سے گلاب کے پھول کھل رہے ہوں۔ اندر زخم اور گھاؤ ہوں تو باہر دنیا جہان کی مسیحائی کرنے کی ایکٹنگ کس لئے؟ اندر ماتمی فضا ہو تو کیا حاصل ہے کہ باہر مسکراہٹوں کے پردے آویزاں ہوں۔ اندر کرواہٹ بھری ہے تو کیا افادیت کہ بر لب گفتار سے شہد ٹپک رہا ہو۔ اندر پستیاں ہوں تو باہر بلند مسندوں پر بیٹھنے سے حقیقی بلندی کیسے پیدا ہو جائے گی؟

خدا اور دل

جن لوگوں کو خدا سے بات بنانی ہو تو وہ سب سے پہلے دل کی خبر لیں! دل درست ہے تو ساری زندگی درست ہوگی اور دل فسادزدہ ہے تو ساری زندگی بگڑ جائے گی۔ دل زندہ ہے تو سب کچھ سلامت، دل مرگیا تو سب کچھ بھسم۔

گھٹیا جذبات کی گندگیوں کے بھبھکے، مرے دلوں کو لے کر جب ہم آخرت

میں پیش ہوں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ قلب سلیم یا اخلاص نیت کے بغیر شاندار فردِ عمل بے کار ہے۔ ریا کے کاموں کی کوئی قدر وہاں نہیں ہے۔ شہرت طلبی کے لئے کی گئی عبادات و خدمات کو ذرہ بھر وزن حاصل نہیں ہے۔ معاملات انسانی اور تعلقات انسانی کو خراب کرنے والوں کو نہ تقریریں بچا سکیں گی نہ تسبیحیں۔ عہدے اور مجلسیں اور بیان اور قراردادیں اور پالیسیاں اور دورے اور استقبال اور پھولوں کے ہار اور دعوتیں اور استقبالیے امراض دل کا علاج نہیں ہیں۔

علاج بیماری دل

امراض دل کا علاج صرف یہ ہے کہ آدمی حالت دل کا جائزہ لے اور جو جو روگ لگ گئے ہوں یا جن جن جراثیم کا حملہ ہوا ان کو اچھی طرح سمجھے۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ کس پستی اور کس گندگی اور کس تاریکی اور کس ذلت سے دوچار ہے۔ وہ دیکھے کہ کن خواہشات نے خانۂ دل پر قبضہ جما رکھا ہے۔ کون سے ارذل جذبات اس میں گندگی پھیلا رہے ہیں کن کن انسانوں اور دوستوں اور رفیقوں کے لئے اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ کن کن لازمی رشتوں اور رابطوں کو کاٹنے والی قینچیاں اس کے سینے میں نصب ہیں۔ کہاں کہاں اس نے بے جا تعلقے بڑھا رکھے ہیں اور کدھر کدھر ناروا قرابتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ کن کن دھڑے بندیوں میں وہ مبتلا ہے۔ کیسی کیسی محبتوں کو اس نے دور دھکیل رکھا ہے۔ کن کن خیرخواہ محبوں کو اس نے دشمنی کے مقام پر جا کھڑا کیا ہے کن دوستوں کو اپنے سینے سے چمٹانے کے بجائے اس نے اپنے آپ سے دور ہٹا رکھا ہے

اس طرح کے سوالات کو سامنے رکھ کر جب دل کا احتساب کیا جائے تو پھر حقائق سامنے آ جاتے ہیں اور اپنی اصلاح کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

صفائی دل

جس لمحے میں حول شیطانی کی یورش کم ہو، ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ ہم

اپنے دل کی دنیا تک رسائی حاصل کریں۔ ایسے لمحے میں آدمی کو اپنے خلاف آپ ناقد اور محاسب بن جانا چاہئے۔ ان تمام زہریلے کانٹوں کو دل سے چن چن کر نکالنا چاہئے جو اسے جابر و متکبر اور بخیل و قنوط بناتے ہیں۔ اس مقدس مکان میں سے ہر ایک چیز کو نکال کر باہر پھینک دیجئے۔ اس میں جھاڑو دیجئے، چھڑکاؤ کیجئے اور انوار کے چراغ جلایئے۔

مومن کا دل ایمان والا دل ہونا چاہئے جو عبدیت کے احساس سے مالا مال ہو اور خدا کی عبادت کے اخلاص مندانہ جذبے کے ساتھ مخلوق خدا کی بہتر سے بہتر خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہو۔

اسباب تقویت

اس کام میں جہاں روزہ اور نماز سے مدد ملتی ہے وہاں قرآن کو شوق و رغبت کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اذکار مسنونہ کی کثرت بڑی مفید ہے۔ صدقہ و انفاق باعث برکت ہے۔ صدقہ کی یہ شکل خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اپنے سے کمزور انسانوں تک آدمی چل کر جائے۔ ان کے احوال میں دلچسپی لے اور ان کے مصائب کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دے جس کسی کو دنیا والوں نے پستی میں ڈالا ہو اسے گلے سے لگا کر اٹھا کھڑا کرے اور احساس دلائے کہ تم اونچے ہو اور سربلندی کو حاصل کر سکتے ہو۔

جو بھی گروہ بندیاں خالص حق کی بنیاد پر قائم نہ ہوں ان سے نجات حاصل کرے۔

عین الحق قاسمی ایم۔ اے (علیگ)
جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

جاہلی شاعری کا مطالعہ

(پہلی قسط)

جاہلی دور عہد ما قبل اسلام کو جاہلی دور کہا جاتا ہے، اس دور کا شمار ۴۵۰ء سے ۶۲۲ء تک کیا جاتا ہے، اس پورے عرصے میں عربوں کے یہاں زبان و بیان کی کیا شکلیں تھیں؟ اس کا اندازہ ذیل کی سطروں میں جاہلی شاعری کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

عرب قوم دنیا کی قوموں میں شاید عرب ہی وہ قوم ہے جسے شاعری کا ذوق فطری طور پر ملا ہے، یہ قوم بدویانہ زندگی گذارتی تھی جس کی وجہ سے سادہ طبیعت ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں عصبیت اور حریت کے جذبات بدرجہ اتم موجود ہیں، ان کی طبیعتیں حساس اور پرجوش ہیں، خوف اور خوشی کے جذبات بہت جلد ان کو برانگیختہ کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو خیال ان کے دل میں آیا یا جس چیز کا احساس ہوا فوراً اس کو نظم کر دیا۔ زبان اتنی شیریں اور پُر اثر پائی تھی کہ دل کی بات کو جب الفاظ کے پیکر میں ڈھالتے تھے تو جادو بن جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ جاہلی دور کی شاعری کا جو سرمایہ ہم تک پہونچا ہے وہ بہت قیمتی اور وقیع ہے۔

شعر و شاعری جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ شاعری اہل عرب کے مزاج و طبیعت

میں دلچسپی لیتی تھی اس کی کئی وجہیں ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ عرب فطرتاً حساس دل، لطیف شعور، فیاض طبیعت اور خود دار واقع ہوئے تھے زبان و بیان پر عبور و عبور رکھتے تھے اور جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہوں تو ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں خیالات و جذبات کا دریا موجزن ہو اور وہ زبان سے ان کا اظہار نہ کریں؟ کیونکہ عرب ہی کا یہ قول:

"ما تجیش به صدورنا — جس سے ہمارے دل بے قابو ہونے لگتے ہیں
فتقذفه علی ألسنتنا" — ہم اسے زبان پر لاتے ہیں، اس بات کی
پوری تائید کرتا ہے۔

۲۔ اہل عرب کی شعر گوئی اور اس میں دیگر اقوام سے سبقت لے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی زبان (عربی) ہی شعری زبان ہے۔ وہ اس لئے کہ عربی زبان میں استعارے و کنائے کے بہترین اسالیب، لطیف ترین تعبیرات اور مترادفات کی کثرت ہے جس سے قافیہ پیمائی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مترادف الفاظ ہیں، اس لئے شاعری آسان ہے"

مزید براں فرماتے ہیں کہ:

"عربی زبان کو متعدد طرح سے وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔"

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کی بود و باش نہایت کھلی اور صاف فضا میں ہوری ہے جہاں فطری مناظر سے واسطہ اور اس میں غور و فکر کے مواقع زیادہ ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ پاکیزہ اور صاف ماحول میں رہنے والوں کے قلوب و اذہان

بھی صاف و شگفتہ ہوا کرتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ وہاں کے باشندے عرب جیسے آزاد طبیعت اور حسن فطرت کے دلدادہ ہوں تو ماحول کی یہ سازگاری دہقانی شاعری کے لئے اور زیادہ موزوں و مناسب ہو جاتی ہے۔

شعر کی تعریف

شعر وہ فصیح و بلیغ کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ کے ساتھ نادر اور اچھوتے خیالات، لطیف جذبات و احساسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ انسان کے دل و دماغ پر براہ راست اس کا اثر پڑے۔

مکاتب فکر

شعر کی تعریف میں دو طرح کے مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔

۱۔ پہلا مکتبۂ فکر علماء عروض اور ان کے متبعین کا ہے جو "وزن اور قافیہ" کو شعر کے لئے اصل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک شعر اسے اس کلام منظوم کا جس میں وزن اور قافیہ پایا جائے۔

یہ تعریف اس اعتبار سے ناقص اور نامکمل ہے کہ اگر تاریخی واقعات، جغرافیائی حالات اور نحو و صرف اور دیگر علوم و فنون کو وزن و قافیہ کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو ہم اسے شعر نہیں کہہ سکتے، جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب شعر العجم میں لکھتے ہیں۔

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اخلاقی مسائل اگر سادہ طریقے پر نظم کر دیے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی۔" [1]

۲۔ دوسرا مکتبۂ فکر ادباء و ناقدین کا ہے جن کے ہاں نادر خیالات اور لطیف جذبات و احساسات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے انداز میں لفظوں کے ذریعہ اس طرح ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو خواہ نثر میں" [2]

---

[1] شعر العجم حصہ دوم، ص ۱۰، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۸۰ء
[2] حالی: مقدمہ شعر و شاعری ص ۳۴ — ۳۵، مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

یہ لوگ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت حسانؓ کا وہ قول پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹے کے شعر نما کلام کو سن کر فرمایا تھا کہ "رب کعبہ کی قسم یہ تو شعر ہے" [1]

لیکن اکثر عرب اور مغربی ناقدین نے وزن اور قافیہ کو شعر کا لازمی عنصر قرار دیا ہے۔ بقول میتھو آرنولڈ "وزن فنی تکمیل کا ایک عنصر ہے"

محقق طوسی "اساس الاقتباس" میں لکھتے ہیں کہ "سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔" [2] ابن خلدون نے بھی وزن اور قافیہ کو شعر کے لئے شرط لازم قرار دیا ہے چنانچہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"شعر اس کلام بلیغ کو کہیں گے جس کی بنا استعارہ و کنایہ اور وزن و قافیہ پر ہو اور اس کے اجزا مستقل بالاغراض ہوں، ساتھ ہی مخصوص عربی اسلوب بھی ملحوظ ہو" [3]

مشہور عربی ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین کے بقول "عرب اسے شعر کہہ ہی نہیں سکتے جس میں وزن اور قافیہ بھی مفقود ہو۔" چنانچہ شعر کی تعریف و ماہیت پر شرح و بسط سے کلام کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں۔

"والآن نستطيع أن نعرف الشعر بأنه كلام مقيد بالوزن والقافية والذي يقصد به إلى الجمال الفني" [4]

"یعنی اب ہم بلاخوف و خطر شعر کی یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ شعر وہ کلام ہے جس میں وزن و قافیہ کی قید کے ساتھ فنی جمال کا خیال رکھا گیا ہو"

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وزن اور قافیہ شعر کے لئے جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وزن اور قافیہ کے خلاف کوششوں کے

---

[1] واقعہ کی تفصیل جاننے کے لئے ملاحظہ ہو عربی ادب کی تاریخ ص ۱۳۲ : عبدالحلیم ندوی و شعر العجم حصہ اول ص ۹ [2] بحوالہ مقدمہ شعر و شاعری ص ۳۱

[3] مقدمہ ابن خلدون ص ۳،۵۵ - بیروت [4] فی الادب الجاہلی ص ۳۱۲

باوجود دنیا کی زبانوں میں عام طور سے اور عربی زبان میں خاص طور سے وزن کی ضرورت و اہمیت بدستور قائم رہی۔

شاعری کا آغاز

عربوں میں شاعری کا آغاز کب ہوا، اس کی صحیح تاریخ نہیں ملتی البتہ اتنا معلوم ہے کہ جب شاعری کو تاریخ نے جانا تو وہ نہایت محکم اور مرتب قصائد کی شکل اختیار کر چکی تھی، لیکن عقل یہ بات تسلیم نہیں کرتی کہ شاعری اپنے ابتدائی مراحل میں بھی اس قدر پاکیزہ و شستہ اور حسین و دلکش رہی ہوگی۔ یقیناً اسے مختلف ادوار سے گذرنا پڑا ہوگا طرح طرح کے نشیب و فراز اور زیر و بم سے دوچار ہوئی ہوگی تب کہیں جاکر اس میں پختگی نکھار اور حسن پیدا ہوا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ عربوں نے پہلے آزاد نثر سے مسجع جملوں کی طرف قدم بڑھایا ہوگا پھر مسجع جملوں سے رجز کی طرف، پھر بتدریج قصیدہ گوئی تک پہونچے ہوں گے [1] علامہ باقلانی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"عربوں نے زبان کی ابتدا نثر سے کی پھر اس کے ذریعہ شاعری تک پہونچے دراصل شاعری تک ان کی پہونچ اتفاقی ہو گئی، پھر جب شاعری انہیں بھلی اور مناسب معلوم ہوئی اور ان کے کانوں کو اس کا آہنگ اچھا لگا اور ان کی طبیعتیں اس سے مانوس ہو گئیں تو انھوں نے اس کا تتبع شروع کیا، اسے سیکھا اور اس کے لئے طبیعت کو آمادہ بھی کرنا شروع کیا۔

بہرحال یہ بات مسلم ہے کہ سب سے پہلی چیز جو شعر سے ملتی جلتی تھی وہ بھی مسجع جملے تھے جسے عام طور سے کاہن یا سادھو قسم کے مذہبی پیشوا کہا کرتے تھے یہ مقفیٰ جملے ہوتے تھے جنہیں منتروں کی طرح عبادت گاہوں میں دعا وغیرہ

---

[1] احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی ص ۲۸

کے موقع پر کہا جاتا تھا، یا ان کے ذریعہ حکمت و فلسفہ کی باتوں کو زبانی یاد کیا جاتا تھا، یا وہ علوم جنہیں عرب یاد رکھنا چاہتے تھے انھیں مسجع اور مختصر جملوں میں زبانی یاد کرلیتے تھے۔ اس مسجع میں رفتہ رفتہ وزن اور قافیہ کا اضافہ ہوا اس طرح شعر کی ابتدائی قدیم شکل پیدا ہوئی جسے "رجز" کہتے ہیں۔ رجز کی ایجاد کے بعد اس میں اور ترقی ہوئی اور دوسرے اوزان اور بحریں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ رزمیہ اور فخریہ مواقع کے لئے الگ الگ وزن ایجاد ہوئے اور غزل وغیرہ کے لئے الگ۔ اسی طرح رفتہ رفتہ عربی شاعری کی تمام بحریں پیدا ہوئیں جن کی تعداد خلیل احمد کے نزدیک پندرہ ہے۔[1] اس میں مشہور نحوی اخفش نے ایک اور بحر کا اضافہ کیا ہے، جس کا نام اس نے "متدارک" رکھا۔

رجز کی ایجاد

کہا جاتا ہے کہ مضر بن نزار ایک شخص اپنے اونٹ پر سے ایک مرتبہ گر پڑا اور اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے تو اس نے شدت تکلیف کی وجہ سے چلا چلا کر کہنا شروع کیا "وایداہ، وایداہ" ہائے میرے دونوں ہاتھ، ہائے میرے دونوں ہاتھ۔ اس کے منہ سے یہ آواز ایک خاص زیر و بم کے ساتھ نکل رہی تھی جس میں درد کی وجہ سے بلا کا سوز بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اونٹ نے اس آواز کو غور سے سنا اور رفتار تیز کر دی۔ یہ دیکھ کر عربوں کو اس کا اندازہ ہوا کہ اس طرح کی آواز اونٹوں پر اچھا اثر ڈالتی ہے اور وہ تیز چلنے لگتے ہیں چنانچہ اس کا تجربہ کیا گیا تو یہ خیال صحیح نکلا۔ یہیں سے "حدی خوانی" کی اصطلاح بنی جو دراصل گانے کی ایک شکل تھی، اور اسی گانے کو "رجز" کہتے ہیں۔

جاہلی شاعری کی خصوصیات

بدویانہ زندگی اور تمدن سے دوری کی وجہ سے جاہلی شاعری انتہائی سادہ اور شاعری تکلفات سے خالی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ایجاز و اختصار زیادہ ہے، مجاز کم، اور مبالغہ تو کالعدم ہی معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اس شاعری کی پہلی خصوصیت راستی اور سچائی ہے۔ بقول مولانا حالی:-

"عرب جاہلیہ اور صدر اول کے شعراء جھوٹ سے نہایت نفرت کرتے تھے اور

[1] احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی ص ۲۵

اس کو عیوب شاعری میں سمجھتے تھے۔"[1]

یعنی قول و عمل میں یکسانیت و ہم آہنگی، کسی جذبے کی بے کم و کاست پوری اور سچی عکاسی، فطرت کی صحیح ترجمانی اس شاعری کا خاصہ ہے۔

۲۔ اس کے علاوہ عرب شعراء کی زبان میں تندی و تیزی اور فکر و خیال میں آزادی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ علامہ شبلی نعمانی شیخ سعدی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے "آزادی" ہے عرب کی شاعری کی اصل روح یہی تھی جو عجم میں آکر گم ہوگئی تھی، عرب کے شعراء سلاطین اور امراء کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے"۔[2]

۳۔ تیسری خصوصیت اس شاعری کی یہ ہے کہ اس میں منطقی طریقوں اور طبعی تقاضوں کے مطابق ترتیب اور تسلسل افکار پر بہت کم توجہ دی گئی ہے، چنانچہ معانی و مضامین کا ربط بہت کمزور ہے، شعروں کی ترتیب بے جوڑ اور ڈھیلی ہے حتی کہ اگر شعروں کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر بھی کر دی جائے تو بھی کوئی خاص فرق یا خامی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عرب کے بدو فلسفیانہ ذہن نہیں رکھتے تھے ان کی نظر میں تمام اشیاء و حوادث ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہوتے ہیں جنھیں کوئی رشتہ باہم نہیں ملاتا یہی وجہ ہے کہ عرب دیوان میں کسی شاعری کو پرکھنے کیلئے ایک شعر کافی ہوتا ہے نہ کہ پورا قصیدہ۔

۴۔ چوتھی خصوصیت نامانوس الفاظ کا استعمال اور جملوں اور ترکیبوں کی شوکت و متانت ہے۔ ایں ہمہ جاہلی شاعری کی دیگر خصوصیات میں کہیں "تشبیب" کی شکل میں بے لاگ اظہار محبت ہے تو کہیں "مرثیہ" کی صورت میں بے تحاشا

[1] مقدمہ شعر و شاعری ص ۹۰ [2] شعر العجم حصہ دوم ص ۵۵

اظہار غم بھی ہے، کہیں "ہجوگوئی" کے ذریعہ اپنے مد مقابل کو مات کر دینے کی بھرپور کوشش ہے تو کہیں "وصف" کے انداز میں کسی چیز یا پیکر کی سراپا منظر کشی ہے۔

اصناف واقسام

مشہور اور مروجہ اصناف شعری جن میں جاہلی دور کے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

تشبیب، مدح، مرثیہ، ہجو، فخر وحماسہ اور وصف۔

کہا جاتا ہے کہ مرثیہ شاعری دراصل مدحیہ کی فرع ہے کیونکہ وہ بھی ایک طرح سے میت کی مدح ہی ہے [1]

تشبیب

تشبیب، نسیب، غزل یہ لغوی اعتبار سے بہت تھوڑا فرق ہے اور ان سب الفاظ کے معنی ہیں "حديث الفتيان والفتيات والتحدث مع النساء ومغازلتهن" [2] نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی آپس کی بات چیت اور عورتوں سے دل لگی اور حسن ومحبت کی باتیں کرنا۔

بقول ابن سلام الجمحی "يعني الغزل والنسيب والتشبيب كلمات مترادفة" یعنی غزل، نسیب اور تشبیب ہم معنی الفاظ ہیں [3]

غزل کے بارے میں ڈاکٹر طہ حسین کا خیال ہے کہ "غزل کا فن عہد جاہلی میں اپنی

---

[1] طہ حسین: فی الادب الجاہلی ص ۳۱۲ وجرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۱ ص ۹۳ [2] لسان العرب، فصل اللام دل،

[3] طبقات فحول الشعراء ص :

تکمیل کو نہیں پہونچا تھا بلکہ اس کی تکمیل اموی دور میں ہوئی [1]

یہ خیال صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جاہلی دور میں جو قصیدے کہے گئے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ملتا جس کی نوعیت خالص غزل کی رہی ہو، بلکہ غزل ان قصائد کا ایک حصہ ہوتی تھی جسے "تشبیب" کہا جاتا ہے، جیسا کہ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:—

"قدماء تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے، قصائد کی ابتداء میں عرب کے طرز پر تشبیب کہتے تھے۔ یہی اس زمانہ کی غزل تھی" [2]

وہ شعراء جن کے کلام میں غزل کا رنگ وحسن زیادہ نمایاں ہے ان میں امرؤ القیس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

مدح

مدحیہ شاعری کے ذریعہ شعراء اپنے آباء واجداد اور قوم کے فضائل وکمالات ان کے اچھے اخلاق، مہمان نوازی، شجاعت، عدالت، اور ان کی برتری اوصاف بڑے فخر سے گنایا کرتے تھے اور اس طرح وہ اپنے قبیلہ کا دفاع کرتے تھے، اس کے علاوہ، سلاطین، ملوک اور خلفاء وامراء کے کارنامے اور محاسن بیان کرتے تھے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مدحیہ شاعری کا عروج جاہلی شاعری میں اس وقت ہوا جب ممدوحین نے اس کے صلہ میں خوب انعام واکرام سے نوازنا شروع کیا۔

مدحیہ شاعری میں زہیر بن ابی سلمیٰ، نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ہجو

ہجو دراصل مدح کی ضد ہے جس کے ذریعہ کسی کی برائی بیان کی جاتی ہے یا کسی کیلئے

---

[1] فی الادب الجاہلی ص ...

[2] شعر العجم حصہ دوم ص ۵۸

یا گروہ کو نیچا دکھانے کے لیے اس پر کیچڑ اُچھالا جاتا ہے، تاکہ اپنی حیثیت بحال اور برتر ہو اور فریقِ مخالف استہزا اور مذاق کی چیز بن جائے۔

مرثیہ

اس کے ذریعہ شاعر کسی مرنے والے پر غم کے آنسو بہاتا ہے اور اس کے ایک ایک وصف کا ذکر کرکے خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رُلاتا ہے، اندازِ بیان ایسا اپناتا ہے کہ لوگ اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جاہلی دور میں جب کوئی کسی کی موت پر مرثیہ کہتا تھا تو وہ بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہوں کی موت، عظیم الشان ملکوں اور قوموں کی تباہی اور فنا کی مثالیں دیتا، اور ان کے مقابلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے تنومند پہاڑی بکروں، اور جھاڑیوں میں چھپے رہنے والے شیروں اور چٹیل میدانوں میں پھرنے والے زیبروں، گدھوں، عقابوں اور سانپوں کی قوت و درازیٔ عمر کی طرف توجہ دلاتا[1] جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ دیکھو! بڑے اور شریف لوگوں کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں اور جنگلی جانور، چرند و پرند بہت دنوں تک جیتے رہتے ہیں، گویا موت بڑائی کی نشانی ہے اور طولِ عمر بے مصرف ذلت کی زندگی کی۔

فخر و حماسہ

جاہلی شاعری کی یہ صنف بھی کافی مقبول و معروف رہی ہے، اس کے ذریعہ شاعر اپنے قومی و نسبی تفاخر اور شجاعت و دلیری کی داستانیں سناتا، اور دوسرے قبائل کے مقابلے میں اپنی اور اپنی قوم کی بڑائی اور فضائل و مناقب بڑی شان سے گناتا، اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی برتری کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتا۔

ابو تمام کا دیوانِ حماسہ اس سلسلے کی مشہور کڑی ہے، اس صنفِ خاص میں عمرو بن

---

[1] ابن رشیق: العمدة، الجزء الثانی، ص ۱۵۰، بیروت

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

مولانا امین احسن اصلاحی

پاکستان میں دینی تعلیم

"یہ تقریر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ستمبر [illegible]ء میں 'شامِ ہمدرد' کی ایک تقریب میں کی۔"

حضرات! میں جناب حکیم صاحب محترم کا صدقِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس ناچیز کے لیے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کا ایک موقع فراہم کیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ایسے مسئلے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے لیے ایک دردِ دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس درد کی کوئی کسک میں آپ کے دلوں میں بھی پیدا کر سکا تو سمجھوں گا کہ میرا بیان اثر سے خالی نہیں رہا۔ اگرچہ ایک طبیبِ حاذق کی ترتیب دی ہوئی اس مجلس میں میری طرف سے درد کا تحفہ تقسیم کیا جانا بظاہر ایک ناموزوں سی بات ہے۔ اطبا کے پاس لوگ دوا کے لیے آیا کرتے ہیں نہ کہ درد کے لیے، لیکن آپ اطمینان رکھیں میں جو درد تقسیم کرنا چاہتا ہوں وہ سر کا درد نہیں بلکہ دل کا درد ہے۔ دل کے متعلق تو شاید آپ بھی یہ تسلیم کرتے ہوں گے کہ اس کی صحت و زندگی تمام تر اس کی دردمندی ہی پر منحصر ہے۔ اگر دل میں درد نہ ہو تو پھر وہ دل نہیں ہے بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو سینے میں چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں، بلکہ زمین پر پھینک دینے کی چیز ہے۔

حضرات! آپ جیسے ہوش مند لوگوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ہم مسلمان نسل و نسب، رنگ و خون، ملک و وطن، دریا اور پہاڑ کی حدبندیوں کی پیدا کی ہوئی کوئی قوم نہیں ہیں۔ ہم اس طرح وجود میں نہیں آگئے ہیں جس طرح کیکر کی جڑ سے دوسرا کیکر اور آم کی گٹھلی سے دوسرا آم پیدا ہو جایا کرتا ہے، بلکہ ہم ایک مخصوص نظریۂ حیات، ایک مخصوص نظامِ عقائد و اعمال اور ایک مخصوص طرز

زندگی سے ترکیب پائی ہے۔ ایک نسخہ ہے، جس کا نام اسلام ہے۔ یہی اسلام ہے جو ہمیں دوسروں سے الگ کرتا اور آپس میں ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ یہی خلق اور خالق کے ساتھ ہمارے حقوق و فرائض کی حد بندی کرتا ہے۔ یہی ہماری دنیا اور عقبیٰ دونوں کی کامیابیوں کا ضامن ہے اور ہمارے رب کی طرف سے اسی پر چلنے اور اسی پر پورے کا ہم سے مطالبہ ہے۔

حضرات! قاعدہ ہے کہ جو چیز جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے انہی عناصر پر اس کی صحت و زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ عناصر مناسب مقدار میں موجود رہیں تو وہ چیز صحیح حالت میں رہتی ہے۔ اگر وہ کم ہو جائیں تو وہ چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اگر وہ مفقود ہو جائیں تو وہ چیز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو آپ خود اپنے جسم کی مثال سے نہایت بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا جسم جن اجزا سے مرکب ہے انہی اجزا کی متناسب موجودگی سے وہ توانا اور صحت مند رہتا ہے۔ اگر وہ اجزا تحلیل ہو جائیں اور آپ اس کے لیے مناسب غذا اور پرہیز سے بدل ما یتحلل فراہم کرتے رہیں تو آپ کمزور یا مریض ہو جاتے ہیں اور آپ کو کسی حاذق حکیم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو تشخیص کر کے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ آپ نے اپنی بے احتیاطیوں سے اپنے جسم کے کن اجزائے ترکیبی کو نقصان پہنچایا ہے اور پھر اس سے آپ کے نظام جسمانی میں کیا کیا خلل واقع ہو گئے ہیں اور اب ان کی اصلاح و تلافی کے لیے کیا کیا احتیاطیں اور کیا کیا غذائیں اور دوائیں ضروری ہیں۔

میں کوئی طبیب نہیں ہوں، لیکن اتنی بات تو ایک عامی بھی جانتا ہے کہ غذا یا دوا اس سے اصل مقصود انہی عناصر کو مدد پہنچانا ہوتا ہے جن سے ہمارے جسم کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگر کبھی ہم محض اپنے اندر ایک جوش و نشاط پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز استعمال کر بیٹھتے ہیں، جو ہمارے اصل تعمیری اجزا سے موافقت نہیں رکھتی تو اس سے ایک وقتی جوش و ہیجان تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے جسے ہم غلط فہمی سے علامت صحت خیال کر بیٹھتے ہیں، لیکن بالآخر اس کا رد عمل نہایت برا ہوتا ہے، جس سے بسا اوقات ہم اپنا مزاجی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

ٹھیک اپنے جسم ہی پر آپ اپنے جسد ملی کو قیاس کیجیے۔ ہمارے جسد ملی کے ضعف و قوت اور مرض و صحت کا انحصار بھی انہی اجزا کی کمی بیشی اور عدم و وجود پر ہے جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ اس کی تشکیل نسل، نسب، خون، رنگ اور وطن کے رشتوں یا محض زبان اور تہذیب کے

اشتراک سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ جس چیز نے اس کو یکجہتی بخشی ہے وہ قرآن ہے۔ جس چیز نے اس کو بنیان مرصوص بنایا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا رابطہ ہے اور جس چیز نے اس کے اندر زندگی، حرارت اور فدویت و قربانی کا خون دوڑایا ہے، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی محبت ہے۔

اگر آپ مانتے ہیں کہ فی الواقع ملت اسلامیہ کی تعمیر و تشکیل انہی چیزوں سے ہوئی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس واضح حقیقت سے انکار کی جرأت کیسے کر سکتا ہے تو مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیجیے کہ کیا ہم مسلمان ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر دنیا میں قائم رہ سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اس سوال کا جواب نفی ہی میں دے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ میرا یہ سوال ملت اسلامیہ سے متعلق بحیثیت ملت اسلامیہ ہے، یعنی جس حیثیت میں وہ خیر امت قرار دی گئی ہے اور اس کو شہداء اللہ فی الارض کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے۔ اپنی اس مخصوص حیثیت میں قائم رہنے اور اسی حیثیت سے اس کے ترقی کرنے کی واحد شکل اگر ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ جن اجزائے فکری و اعتقادی اور جن عناصر ایمانی و اخلاقی سے وہ وجود پذیر ہوئی ہے ان کا شعور و اعتقاد اس کے تمام افراد میں اگر نہیں تو کم از کم بیشتر میں زندہ و متحرک رہے۔ اگر یہ زندہ و متحرک نہ رہے تو سمجھیے کہ ملت مردہ ہے، اگرچہ اس کے قبضے میں دنیا جہان کے تمام اسباب و وسائل موجود ہوں۔ اگر آپ اس کے اندر زندگی کی حرکت پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا محرک لا گھسائیں گے جو خود اس کے اپنے مزاج سے بیگانہ ہو گا تو اس سے اس کے اندر وقتی طور پر ایک حرکت تو شاید پیدا ہو جائے گی لیکن یہ حرکت اس کی اپنی فطری حرکت سے بالکل مختلف ہو گی۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہو گی جس کا ذکر کچھ عرصے پہلے اخباروں میں آیا تھا کہ کچھ بوڑھوں پر اعادۂ شباب کا تجربہ کرنے کے لیے ان کے اندر بندروں کے غدود منتقل کیے گئے تو اس سے ان کے اندر جو حرکت پیدا ہوئی وہ انسانوں کے مقابل میں بندروں کی حرکات سے زیادہ مشابہ تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف الٹی سیدھی کوئی حرکت ہی مطلوب ہو تب تو کسی بھی جگہ کے نعرے سے پیدا کی جا سکتی ہے اور آج ہمارے مسلمان ممالک میں لیڈر حضرات اس قسم کے نعروں کا تجربہ بھی کر رہے ہیں۔ لیکن پیش نظر اگر صرف کوئی حرکت نہیں بلکہ صحیح قسم کی حرکت اس نصب العین کی راہ میں مطلوب ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی بعثت فرمائی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان افکار و عقائد اور ان اصول و مقاصد کا صحیح شعور و احساس قوم میں پیدا

کیا جائے جن کے شعور و احساس ہی نے اس کو وجود بخشا تھا۔

حضرات! یہ شعور و احساس نہ تو کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد ہے، جو آپ سے آپ باپوں سے بیٹوں کو منتقل ہوتی رہے اور نہ یہ کوئی مادہ ماحضر ہے، جو جب آپ چاہیں لوگوں کے کانوں اور دلوں کے اندر پھونک دیں، بلکہ اس کے پیدا کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے سلسلے کی ضرورت ہے جو ہماری پوری زندگی پر حاوی ہو۔ جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ قرآن کیا ہے اور اس نے ہمیں کیا رہنمائی دی ہے، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس مقصد سے ہوئی اور ہمارے تعلق کی نوعیت ان کے ساتھ کیا ہے، ہمارا قانون کیا ہے اور وہ کن پہلوؤں سے دنیا کے تمام قوانین سے بالاتر ہے، ہمارا فلسفہ کیا ہے اور کن اعتبارات سے وہ دنیا کے تمام فلسفوں پر ترجیح رکھتا ہے، ہماری تاریخ کیا ہے اور کس طرح وہ دنیا کی تمام تاریخوں سے شاندار اور درخشاں ہے، ہمارا نظام زندگی کیا ہے اور کن پہلوؤں سے اس کو دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت حاصل ہے، اس وقت تک ہم کیا جان سکتے ہیں کہ ہم خود کیا ہیں، دنیا میں کیوں آئے ہیں اور ہمیں کس مقصد کے لیے جینا اور کس طریق میں مرنا ہے۔

یہ کام نہایت وسیع و عمیق کام ہے جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارا نظام تعلیم و تربیت اس کی ذمے داری اٹھائے، لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک مدت سے ہمارے ہاں جو نظام ہائے تعلیم و تربیت رائج ہیں وہ دوسرے پہلوؤں سے اپنے اندر جو افادیت بھی رکھتے ہوں، لیکن مذکورہ بالا مقصد کے لحاظ سے ان کی افادیت صفر ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس مقصد کے لیے وہ مفید ہونے کے بجائے الٹے مضر ہیں۔ میری یہ رائے ملک میں رائج دونوں ہی نظاموں سے متعلق ہے۔ اس نظام سے متعلق بھی جو قدیم کہلاتا ہے اور اس نظام سے متعلق بھی جو جدید کے نام سے موسوم ہے اور جس کو اب ملک کے اصلی نظام تعلیم و تربیت کی حیثیت حاصل ہے۔ میں مختصراً ان دونوں کی نوعیت آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت کیا ہے۔ میں پہلے جدید نظام تعلیم کو لیتا ہوں۔

جدید نظام تعلیم کے متعلق آپ یہ جانتے ہیں کہ اس کا تحفہ ہمیں انگریزوں سے ملا ہے۔ اس کو جب انھوں نے ہمارے ملک میں رائج کیا ہے تو ان کے پیش نظر نہ تو یہ بات تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ اس سے ہمارے اندر خود شناسی پیدا ہو، یعنی ہم اپنے آپ کو پہچانیں کہ ہم کیا ہیں، بلکہ واضح طور پر اس سے ان کا مقصود ہمارے اندر انگریز شناسی یا انگریزی شناسی پیدا کرنا تھا تاکہ ان کو اپنے کاموں کے لیے سستے اور وفادار خادم مل سکیں۔

اس مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی تعلیم کی ان کو مطلق ضرورت نہ تھی۔ سیاسی اعتبارات سے بھی وہ ہماری مذہبی تعلیم کو ایک خطرناک چیز سمجھنے پر مجبور تھے، اس لیے کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے اس دور زوال میں بھی اس تعلیم سے سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض وقتی ضروریات اور مسلمانوں کی دل داری کے خیال سے انھوں نے اس کا کوئی حصہ اپنے نظام تعلیم میں سمونے کی کوشش بھی کی تو اول تو اس کی حیثیت اکبر مرحوم کے الفاظ میں بادۂ گلگوں میں زم زم کے چند قطروں سے زیادہ نہ تھی، پھر ان قطروں کو بھی انھوں نے تحلیل کیمیائی کے ذریعے سے اچھی طرح صاف کر لیا تھا کہ ان میں کوئی ایمانی جرثومہ باقی نہ رہ جائے۔

اس نظام تعلیم نے ہماری قوم کے کھاتے پیتے گھرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کے جو برے ثمرات ان پر پڑنے تھے وہ بھی پڑے، لیکن پھر بھی یہ خیریت تھی کہ غربا کے لیے اس تعلیم کے دروازے پوری طرح کشادہ نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو سکے۔ ان میں سے جس کو تعلیم کا شوق ہوا وہ اس مذہبی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا جس کے مرکز مسجدیں، دینی مدرسے اور مختلف علماء کے حلقہ ہائے درس تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تمدن سے ہمارے شرفا کے بھی ایک طبقے میں خطرے کا احساس موجود تھا، اس وجہ سے انگریزی تعلیم کی ساری کششوں کے باوجود یہ طبقہ مذہب اور مذہبی روایات سے وابستہ رہا اور اس طرح کچھ نہ کچھ مذہبی تعلیم کا بھی بھرم قائم رہا۔

انگریزوں کی غلامی سے رہائی کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ہمارے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی ہوتی کہ یہ ہمارے ملی اور اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے والا بن سکتا، ہم دوسروں کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے سے خود اپنے کو بھی پہچان سکتے اور جدید کے استفادے کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم پوری وفاداری کے ساتھ اسی نظام تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں، جو انگریزوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔

اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی ہے تو دینی اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جہاں تک اس تعلیم کی کشش کا تعلق ہے وہ تو انگریزوں کے زمانے کے لحاظ سے اب ہزار گنی بڑھ گئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس سے ایک طبقے میں جو جھجک تھی وہ نہ صرف دور ہو گئی ہے، بلکہ وہ تقلید و محبت سے بدل گئی ہے۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی کے سبب سے دین اور دینی تعلیم کے لیے ہمارے

دل میں حمیت و حمایت کا جو جذبہ تھا وہ اب سرد پڑ چکا ہے۔ ہر درجے کی ملازمت اور ہر میدان میں مسابقت کی راہ اس تعلیم نے اب ہر طبقے کے لیے کھول دی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا قبلہ و کعبہ اب یہی ہے۔ اب غربا کے لیے بھی اس کے دروازے کشادہ ہیں۔ اسی وجہ سے اب ان کے بچے بھی مسجدوں اور عربی مدرسوں کے بجائے اسکولوں اور کالجوں ہی کا رخ کرتے ہیں۔ بس کوئی ایسا ہی مظلوم و مسکین ہوتا ہے، جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تو وہ عربی مدرسوں کی طرف نکل جاتا ہے کہ:

اس عدو پہ نہیں یار تو کعبے ہی کو ہو آئے!

دینی تعلیم کے جو ادارے ہمارے ملک میں تھے یا ہیں، اس اعتبار سے تو وہ تمام دینی حس رکھنے والے مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ آج ہمارے ملک میں جتنا کچھ بھی قال اللہ و قال الرسول کا چرچا ہے، بہر حال انھی کا فیض ہے۔ یہ اگر نہ ہوتے تو انگریزی اقتدار کے بعد ہمارے ملک میں جو انقلاب آیا تھا وہ شاید ہمیں اتنا جاہل بنا دیتا کہ ہمارے اندر نکاح پڑھنے اور جنازے کی نماز پڑھنے والے بھی مشکل ہی سے مل سکتے۔ لیکن ان کے اس احسان کے اعتراف کے ساتھ اس امر واقعی کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ ادارے ایک مدت دراز سے ایک ایسے جمود میں مبتلا ہیں کہ ان سے اس سے زیادہ خدمت کی توقع نہیں کی جا سکتی جو انھوں نے انجام دی۔

اول تو یہ مدارس جس نصاب تعلیم اور جس طریقۂ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں وہ وقت کی ضروریات اور زمانے کے حالات سے اتنا بیگانہ ہے کہ اب اس کے اندر نہ کوئی افادیت باقی رہی ہے نہ کوئی کشش۔ یہ نصاب جس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے موزوں اور دین و دنیا دونوں کا جامع تھا۔ ضرورت تھی کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے قرآن، حدیث، فقہ کے سوا نصاب کے دوسرے اجزا بدل جاتے، لیکن ہمارے دینی مدارس کے کارفرماؤں نے کئی سو سال پہلے کے نصاب کو بھی تقدیس کا یہ درجہ دے رکھا ہے کہ اس میں کسی ترمیم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ طریقۂ تعلیم بھی ان مدارس کا اتنا جان لیوا ہے کہ نئی نسل اس کا کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ اس نصاب اور اس طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے لیے جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جمود ان کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

ان مدارس کے گروہی رجحانات بھی نقطۂ نظر سے مضر ثابت ہوئے۔ دینی مدارس بالعموم الگ

الگ فقہی مسالک کی بنیادوں پر قائم ہوئے اور انھی پر اب تک قائم چلے آ رہے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ مدارس کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم ہوتے اور پوری فقہ اسلامی کی خدمت کرتے اور اس کو آگے بڑھاتے تاکہ ان کے فارغین وسیع زاویۂ نگاہ کے حامل بن کر اٹھتے اور مخصوص اپنے فرقے کی ترجمانی کرنے کے بجائے پوری ملت اسلامیہ کی خدمت کرتے اور عام نوع انسانی پر اللہ کے دین کی شہادت دیتے۔ اس طرح ان کے اندر نہ صرف رواداری بلکہ تحقیق و اجتہاد کی وہ روح بھی پیدا ہوتی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ان مدارس نے اپنا مطمح نظر بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رکھا۔ عام طور پر مدرسی، امامت، فتویٰ نویسی، وعظ گوئی، مناظرہ اور ایک محدود معنی میں تبلیغ تک ان کی نگاہ محدود رہی۔ ہر چند یہ کام بھی ضروری تھے، لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر ہمارے دینی مدارس کے فارغین علمی و عملی زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں نہ ہو سکے۔ صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ رہے، جو غیر معمولی دل و دماغ کے مالک تھے اور جن کی رہنمائی ان مدرسوں سے زیادہ خود ان کے عزم و ہمت نے کی۔

یہ جمود ان مدارس پر بہت پہلے سے طاری تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے اس غلامی کو ہم پر مسلط کرنے میں جو مغربی اقوام بالخصوص انگریزوں کے ہاتھوں ہم پر مسلط ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے حکمران ہو جانے کے بعد تو اس جمود پر شکست اور کس مپرسی کا بھی اضافہ ہو گیا اس لیے کہ حکومت کے انقلاب کے بعد ان کی مادی سرپرستی کا انحصار بیشتر غربا اور عام مسلمانوں کے صدقات و زکوٰۃ پر رہ گیا اور ان سے فائدہ اٹھانے والے بھی بیشتر اسی طبقے کے لوگ رہ گئے جن کو انگریزی تعلیم کی آسانیاں حاصل نہ تھیں۔ گویا انگریزوں کے بعد سے ہمارے ہاں دینی تعلیم اگر زندہ رہی ہے تو وہ زیادہ تر عوام اور غربا کے واسطے سے زندہ رہی ہے۔ حکومت اور امرا کے طبقے کا حصہ اس میں محض برائے نام ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اگر ہمارے اندر اپنے قومی نصب العین کا احساس ہوتا تو دینی تعلیم ہمارے سارے نظام تعلیم کی بنیاد بنتی اور اسی بنیاد پر ہم تمام علوم جدیدہ کی عمارت قائم کرتے لیکن ہوا یہ کہ ہمارے ہاں جس نسبت سے جدید تعلیم کو فروغ ہوا، اسی نسبت سے دینی تعلیم کو زوال ہوا۔ اول تو یہ علاقہ دینی تعلیم کے لحاظ سے تقسیم سے پہلے بھی کچھ زیادہ زرخیز نہ تھا۔ ہماری دینی تعلیم کے جو بڑے بڑے ادارے تھے وہ سارے کے سارے ان شہروں میں تھے جو بھارت کے قبضے میں چلے گئے۔ مشہور کتب خانے

بھی انھی شہروں میں تھے۔ یہاں جو مدارس تھے یا قائم ہوئے اوّل تو وہ کچھ زیادہ باوقار نہ تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو یہاں جدید تعلیم و تہذیب کی بہتی ہوئی گنگا کو چھوڑ کر کس کی شامت آئی ہوئی تھی کہ وہ عربی مدارس کی خشک گردانوں میں اپنی اوقات رائگاں کرے، چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی ادارے یہاں قائم ہیں، ان کے لیے سرمائے کی فراہمی سے زیادہ مشکل کام طلبہ کی فراہمی کا ہے۔ اگر روٹی کپڑا اور کتاب سب کچھ دے کر کچھ طلبہ کسی طرح حاصل بھی ہوتے ہیں تو ان میں علم کا شوق رکھنے والے شاید پانچ فی صد بھی نہیں ہوتے زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا مقصود محض اوقات گزاری ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں دینی مدارس کا یہ حال ہے اور یہی مدارس ہیں جن سے حاملین دین کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ رہے وہ علما، جو پہلے سے موجود تھے یا تقسیم ملک کے بعد یہاں آئے ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، جو چند باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہم ان سے بھی محروم ہو جائیں[۱]۔ اس موقع پر میں آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد دلاتا ہوں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اندر سے علم دین کے اٹھا لیے جانے کی شکل یہ نہ ہوگی کہ وہ لوگوں کے سینوں سے نکال لیا جائے بلکہ دین کے حامل علما اٹھا لیے جائیں گے اور دین سے بے خبر جہلا باقی رہ جائیں گے اور وہ بلا علم فتوے دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

حضرات! اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بحیثیت اُمّتِ مسلمہ اس دنیا میں قائم رہنے کے لیے ہم سب سے زیادہ دین اور دینی تعلیم کے حاجت مند ہیں تو میں آپ کو اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کی دعوت دیتا ہوں جس سے ہم اس وقت اپنے ملک میں دوچار ہیں۔ میں نے اختصار کے خیال سے صرف اپنے ہی ملک کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں دینی تعلیم پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب تو اگر اس کی کچھ رمق باقی بھی تو ایک درجہ کے دینی مدارس اور ان کے علما میں باقی تھی، جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں کا قومی وجود ہی خطرے میں ہے، دین اور دینی تعلیم کا کیا سوال۔ سب آپ تو آپ کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ اس ملک کے سب سے زیادہ تاریخی شہر[۲] کے معزز شہری

۱۔ ۱۹۶۲ء سے آج ۱۹۹۰ء تک یہ محرومی بڑھتی ہی رہی ہے (ادارہ)

۲۔ یعنی لاہور

ہیں۔ یہ شہر آپ کے تہذیب اور آپ کے علوم کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے۔ اس کی خاک میں بڑے بڑے علما دفن ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے یہ سوال اس لیے رکھا ہے کہ آپ غور کریں کہ دینی تعلیم کے تحفظ کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور آپ اس میں اپنا حصّہ کس طرح ادا کر سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ صحیح اور نتیجہ خیز چیز تو یہ تھی کہ اس ملک کا نظامِ تعلیم ہی از سرِ نو اسلام کی بنیاد پر اٹھایا جاتا کہ دین سارے نظامِ تعلیم و تربیت کی روح بن جاتا اور ہم ایک ہی نظامِ تعلیم ہی سے قدیم و جدید دونوں کی برکتیں حاصل کرتے، لیکن یہ محض آرزو ہے اور مجھے یہ آرزو اتنی بعید معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتے رہنے کا مشورہ دینے کے باوجود یہ کہوں گا کہ اس آرزو کے خوش کن تصوّر کے پیچھے دوسری چھوٹی چھوٹی تدبیروں سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔ نظامِ تعلیم کی تبدیلی کا کام نظامِ تعلیم کے کارفرماؤں کا ہے۔ ان حضرات کے متعلق یہی کہنا مشکل ہے کہ یہ دینی تعلیم کی قرار واقعی اہمیت سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اب تک ان کی طرف سے جو کچھ سامنے آیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا دائرۂ عمل ان کے ہاں بھی مسجدوں سے آگے نہیں ہے اور اگر ہے تو اس میں شاید ان کا احساس اس طرح کے لوگوں ہی سے ہے جو دین کو مستشرقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم اور آپ اگر اس کام کی اہمیت سمجھیں تو کچھ نہ کچھ اس کے تحفظ کے لیے کر سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس اگر علم دین کے بقا کو عزیز رکھتے ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنے نصابِ تعلیم کو بدل کر اس کو آسان، مختصر اور زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق بنائیں۔ عربی نحو و صرف اور عربی زبان کی تعلیم جدید طریقے پر دی جائے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے سوا دوسری غیر ضروری چیزیں نصاب سے نکال کر انگریزی زبان اور دوسرے بعض عمرانی علوم کی کتابیں داخل کی جائیں تاکہ ان مدارس سے ایسے علما پیدا ہوں، جو دین کے ساتھ زمانۂ حال کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں اور اپنی قوم کی رہنمائی کر سکیں۔

۲۔ عربی مدارس اپنے ہاں ایک مختصر مگر جامع نصاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ان طلبہ کے لیے بھی رکھیں جو عربی زبان اور علم دین کے حصول کا شوق رکھتے ہیں اور ان کے اوقاتِ فرصت میں ان کو استفادہ کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر سے ایک اچھی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے گی جو دین کی خدمت کر سکیں گے اور ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ کالجوں کے طلبہ کے اندر دین سیکھنے کی تحریک پیدا کر سکیں۔

۳۔ ملک کے جید علما اپنے اپنے ہاں حلقہ ہائے درس قائم کریں، جن میں اس امر کا اہتمام کریں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جن کے اندر دین کا شوق ہے وہ ان کے درس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ درس محض تبرک کی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ تعلیمی نوعیت کے ہوں تاکہ تعلیم دین کے نقطۂ نظر سے مفید ہو سکیں۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر روزانہ صرف دو گھنٹے بھی اس کام پر صرف کیے جائیں تو تین سال کے عرصے میں یونیورسٹیوں کے فاضلین کی ایک جماعت کو عربی زبان اور پورے دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے اور یہ لوگ ہر میدان میں دین کی خدمت کے لائق ہو سکتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل ہے کہ ابھی ہماری قوم میں علم دین کے ایسے قدردان موجود ہیں۔

۴۔ بڑے شہروں میں اسلامی ہاسٹل قائم کیے جائیں جن میں کالجوں کے طلبہ کے لیے قیام اور اسلامی تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ہر شہر کے شرفا ان ہاسٹلوں کی سرپرستی میں حصہ لیں۔

حضرات! یہ سارے کام اس صورت میں ممکن ہیں جب ملک کے جوش مند اور درد مند لوگ اس کام کی اہمیت سمجھیں، دوسروں کو اس کی اہمیت سمجھائیں اور جہاں بھی کام کرنے کا امکان ہو اس کے لیے راہیں ہموار کریں اور جہاں کام ہو رہا ہو اس میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کام صرف علما ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کو اس ملک میں اسلام کا مستقبل عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ملک میں خیر امت اور شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت سے سربلند ہوں اور ہماری سربلندی اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔ آمین

گذارش

حیات نو کے بہت سارے پرچے ڈاک سے واپس آجاتے ہیں یا تو ہمارے ان خریداروں کا پتہ بدل گیا ہے یا ہمارے رجسٹر ہی میں غلط اندراج ہے۔ براہ کرم جن لوگوں کو حیات نو نہیں مل رہا ہو وہ اپنا صاف پتہ بڑے حروف میں خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ لکھ کر بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

★ عبد البر اثری فلاحی

انسان جوابدہ کیوں؟

اگر میں آپ سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہوں اور وہ درخت آپ سے آپ آپ کے اوپر گر پڑے اور آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ کس سے شکایت کریں گے، جواب آپ کا نفی میں ہوگا یعنی یہ کہ کسی سے ہم کو شکایت نہیں ہوگی۔ اور مان لیجیے کہ اسی درخت کے اوپر ایک شخص سوار ہے وہ اوپر کوئی شاخ کاٹ رہا ہے۔ اور وہ آپ کے اوپر گر پڑے پھر اس سے آپ کو تکلیف پہنچے تو کیا اس صورت میں آپ کو کوئی شکایت ہوگی۔؟ آپ کا جواب اثبات میں ہوگا یعنی یہ کہ اس فرد سے آپ کو شکایت ہوگی کہ اس نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے اور پھر آپ اس سے بدلہ لینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تکلیف تو دونوں صورتوں میں آپ کو پہنچی ہے لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ شکایت صرف دوسری صورت میں ہو رہی ہے۔ اور پہلی صورت میں نہیں ہو رہی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آپ گہرائی سے وجہ تلاش کریں گے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ درخت چونکہ صحیح اور غلط نفع اور نقصان کی تمیز نہیں رکھتا ہے اس لیے وہ کسی کام میں تکلیف و آرام کے لحاظ کا پابند نہیں اور اس لیے اس سے اس لحاظ کو برتنے کا نہ تو مطالبہ ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی شکایت ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسان چونکہ غلط اور صحیح، نفع اور نقصان کی تمیز رکھتا ہے۔

وقت لگتا ہے۔ اسی طرح ایک شرابی یہ جانتا ہے کہ شراب پینے سے اس کا مال بھی ضائع ہو رہا ہے۔ اس کی صحت بھی جا رہی ہے۔ اس کے اخلاق و کردار بھی متاثر ہو رہے ہیں اور اس کی حیثیت بھی معاشرے میں گر رہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی شراب پیے جاتا ہے اور بجائے ختم ہونے کے عادت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جب آپ اس کے اسباب پر غور کریں گے تو آپ کو اس کے بہت سارے اسباب نظر آئیں گے لیکن اپنے مطالعہ اور تجربے میں نے جو اسباب سمجھے ہیں انہیں آپ کے سامنے بیان کیے دیتا ہوں۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسان کی ایک فطری کمزوری ہے اور وہ کمزوری ہے "جہالت" اور اس میں ڈال کر اسے آزمایا جا رہا ہے۔ جیسا کہ انسان کی اس کمزوری کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس وقت اشارہ کر دیا تھا جب کہ "خلافت" کا بوجھ اس کے حوالے کیا تھا۔

سورۂ احزاب آیت ۷۲ میں ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۔

ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

اس آیت کے اندر انسان کے امانت کا بوجھ اٹھا لینے کے بعد اس کی دو صفات کی طرف بھی اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر دیا ہے۔ ایک تو ظلوم یعنی زیادتی و حق تلفی کرنے والا جس کا احساس فرشتوں کو بھی ہو چکا تھا اور اس کا اظہار انھوں نے "اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء" (کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کا انتظام بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا) کے الفاظ سے کیا تھا۔

لیکن دراصل یہ اس کا ردعمل اور روش ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ اور

اس لیے اس سے ان کے پاس و لحاظ کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس سے عدم لحاظ پر شکایت بھی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو پہلی صورت میں شکایت نہیں ہوتی اور دوسری صورت میں شکایت ہوتی ہے۔ یا اسی طرح مان لیجیے کہ ایک جانور آپ کے کھیت میں گھس جاتا ہے اور آپ کی فصل کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس وقت بھی گرچہ آپ جانور کو مار کر بھگا دیتے ہیں یا پکڑ کر قید کر لیتے ہیں لیکن آپ کو اصل شکایت جانور سے نہیں ہوتی ہے بلکہ آپ اس کے مالک سے ناراض ہوتے ہیں اسے برا بھلا کہتے ہیں اور بس چلے تو اس سے بدلہ لینے یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بھی اگر آپ غور کریں تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ جانور سے آپ کو شکایت صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ غلط اور صحیح کی تمیز نہیں رکھتا اور جانور کے مالک سے آپ کو شکایت صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ صحیح اور غلط، نفع و نقصان کی تمیز رکھتا ہے اور اس کے باوجود اس نے اپنے جانور کو کنٹرول نہیں کیا۔ گویا اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے لہٰذا اسے سزا ملنی چاہیے یا پھر وہ نقصان کا بدلہ دے۔

اس پوری گفتگو سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ دنیا کی دوسری چیزوں اور انسان کے درمیان فرق ہے اور یہ فرق یہ ہے کہ دوسری چیزیں صحیح و غلط اور نفع و نقصان کی تمیز نہیں رکھتیں، خواہ وہ چوپائے ہوں یا نباتات ہوں یا جمادات ہوں لیکن انسان صحیح و غلط اور نفع و نقصان کی تمیز رکھتا ہے۔ اور اپنی اسی واقفیت کی وجہ سے وہ اپنے ہر عمل کے سلسلے میں ذمہ دار اور جوابدہ ہے کہ اس نے کون سا کام صحیح اور کون سا کام غلط کیا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ انسان جب اپنا نفع و نقصان جانتا ہے اور غلط و صحیح میں تمیز کر سکتا ہے تو آخر اس کا لحاظ کیوں نہیں کرتا اور عملی زندگی میں اسے کیوں نہیں برتتا۔ عملی زندگی میں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ جانتے بوجھتے اس کے خلاف کرتے ہیں۔ ایک طالب علم یہ جانتا ہے کہ سال بھر کی محنت پر ہی اس کی بہترین کامیابی کا انحصار ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ ناکام ہو جائے۔ پھر بھی پڑھنے سے زیادہ وہ کھیل کود، لہو و لعب، گپ شپ اور فضول چیزوں میں اپنا

دوسری صفت جو بیان کی گئی ہے یا اس کا سبب اور اس کی علت ہے یعنی جہالت مطلب یہ ہے کہ انسان جو غلط روش اپناتا ہے خواہ وہ زیادتی کی شکل میں ہو یا حق تلفی کی شکل میں اس کا سبب اس کی جہالت ہے۔ اور یہ اس کی فطری کمزوری ہے۔ یہاں پر ایک منٹ ٹھہر کر جہالت کا صحیح مفہوم بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عام طور سے جہالت کا مفہوم لاعلمی اور عدم واقفیت سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ لفظ جہالت کا ایک معنی ہے اس کے علاوہ ایک دوسرا معنی بھی آتا ہے اور وہ ہے جانتے ہوئے جذبات کی رو میں بہہ کر غلط کام کرنا۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ یا اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر دوسرے ہی معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئك يتوب الله عليهم وكان الله عليما حكيما	اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو جذبات کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گذرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے
(سورۂ نساء)	

اس آیت میں لفظ جہالت اسی معنی میں استعمال ہوا اس وجہ سے کہ برائی کوئی خواہش سے نہیں کرتا بلکہ اسے برائی سمجھتے ہوئے جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔

اسی طرح عرب شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ دوسرے معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک معلقاتی شاعر کہتا ہے۔

الا لا يجهلن احد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا

آگاہ ہو کہ کوئی ہمارے خلاف جان بوجھ کر غلط اقدام نہ کرے کہ ہم بھی ان غلط اقدام کرنے والوں سے بڑھ کر جانتے بوجھتے غلط اقدام کر بیٹھیں۔

اس پوری گفتگو سے صاف واضح ہے کہ جہالت صرف لاعلمی کا نام نہیں ہے بلکہ

علم کے باوجود جذبات اور خواہشات ولذات کی رو میں بہہ جانے کا بھی نام ہے۔ اسی طرح غلط علم بھی جہالت میں شامل ہے کیونکہ غلط علم بھی دراصل حقیقت کی لاعلمی ہی کا نام ہے کیونکہ غلط علم کا مطلب بھی یہ ہے کہ آپ مطلوبہ چیز کا علم نہیں رکھتے اور دوسری فضول چیزیں آپ جانتے ہیں۔

اب آپ تمام انسانوں کا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے گا کیا ان اسباب کے علاوہ کچھ اور ان کی غلط روش کا سبب ہے۔ کچھ تو لاعلمی کی وجہ سے غلط روش اپناتے ہیں۔ کچھ غلط علم کی وجہ سے غلط روش اپناتے ہیں اور کچھ جانتے بوجھتے جذبات ولذات کی رو میں آکر غلط روش اپناتے ہیں میں نہیں سمجھتا کہ ان اسباب کے علاوہ بھی ان کے غلط روش اپنانے کی کوئی وجہ بنتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہوں تو مجھے بھی بتائیں کیونکہ اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں سب فروعی ہیں اور سب اسی ضمن میں آجاتی ہیں۔

یہاں پر جھٹ آپ کا یہ اعتراض ہوگا کہ اس میں انسانوں کا کیا قصور ہے؟ یہ تو انسانوں کی فطری کمزوری ہے اور اسے بھی اللہ ہی نے اس کے اندر ودیعت کیا ہے لہٰذا انسان ایسا کرنے پر مجبور و بے بس ہے لیکن ٹھہریئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ بات اتنے پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ معاملہ اس سے آگے بھی ہے اور بات یہ ہے کہ جس اللہ نے انسان کے اندر یہ کمزوری اور بیماری رکھی ہے اسی نے اس کا علاج بھی بتا رکھا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی اس بیماری اور کمزوری کو باقی رکھتا ہے یا دوا کا استعمال کر کے شفا حاصل کرتا ہے اور یہی وہ دوراہا ہے جہاں انسان کو سوچنا پڑتا ہے اور وہ آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے؛ کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ کس کو اپنائے اور یہیں انسان بااختیار ہو جاتا ہے چاہے غلط روش اپنا کر کمزوری اور بیماری پر قائم رہے چاہے دوا کا استعمال کر کے شفایاب ہو جائے اب یہ اس کے اختیار کی بات ہے کہ کس کو ترجیح دیتا ہے اور یہی ترجیح دراصل اس کی آزمائش ہے۔

اب آپ کا یہ سوال ہوگا کہ ذرا دوا و علاج بھی بتا دیجئے تو کان کھول کر سنئے کہ جب فرشتوں نے اللہ کے حضور انسان کی اس کمزوری کا اظہار کیا تھا۔ تو اس وقت اللہ نے انسانوں

کے بعد اب حضرت آدم علیہ السلام کو اولاً تو اسماء کا علم عطا کیا تھا جیسا کہ فرمایا:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔	اور سکھائے آدم کو تمام اسماء سکھائے۔ (البقرہ ۳۱)

یعنی دنیا کے اندر جتنی چیزیں ہیں ہر ایک کی ماہیت اور صفات بتائیں تاکہ وہ ان کی روشنی میں ان کی نفع بخشی یا ضرر رسانی سے واقف ہو سکے اور اس کا خیال رکھتے ہوئے دنیا کی تمام چیزوں کو برت سکے اور یہ بات اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام ہی چیزیں اپنی صفات ہی کے ذریعہ پہچانی جاتی ہیں اور اسی کی روشنی میں ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یا اس کے نقصان سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اسماء کا لفظ صفات کے معنی میں آتا ہے یا نہیں تو اس کے لئے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں خود قرآن مجید کے اندر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف آیت ۱۸۰ میں آیا ہے۔

وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى	اللہ کے لئے اچھے نام (صفات)
فَادْعُوهُ بِهَا۔	ہیں اس کو انہی سے پکارو۔

یہاں لفظ "اسماء" اللہ تعالیٰ کی صفات ہی کے معنی میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اللہ کو جب بھی پکارتے ہیں۔ اس کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کی صفات سے بھی پکارتے ہیں۔ تمام اوراد و دعاؤں پر ایک نظر ڈال لی جائے ہر جگہ آپ کو مختلف صفات کی روشنی ہی میں دعوت و پکار نظر آئے گی۔

یہ وہ دوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری کو دور کرنے کے لئے تجویز فرمائی ہے اور ابتدائے آفرینش ہی میں عطا کر دیا تھا تاکہ دنیا میں پہنچ کر کسی زحمت کا شکار نہ ہوں اور فرشتوں کے اظہار رائے کے جواب کے لئے بھی اتنی بات کافی ہو گئی تھی اور بعد میں انھوں نے اپنی کم علمی کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ لیکن اللہ کا یہ عطیہ اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے گرچہ علاج کے لئے کافی تھا لیکن پھر بھی اس سے نا علمی اور غلط واقفیت کا جس حد تک علاج ہو سکتا ہے اس حد تک انسان کے اندر پائی جانے والی کمزوری کا ایک پہلو یعنی جانتے بوجھتے جذبات کی رو میں بہہ جانا اس کا علاج نہیں ہوپاتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے لذات و

جذبات اور خواہشات پر کنٹرول کرنے کے لئے انبیاء و رسل کے توسط سے بذریعہ وحی اپنی کتب و شریعت نازل فرمائی۔ کتاب میں صحیح اور غلط کی حد بندی کی اور اس کی پابندی پر انعام و اکرام کی بشارت دی اور عدم پابندی پر عذاب و سزا سے ڈرایا۔ جیسا کہ اسی سلسلۂ واقعہ کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى	پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس
فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا	پہنچے جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔
يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا	اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولٰئِكَ	گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا	آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں
خَالِدُونَ۔	وہ ہمیشہ رہیں گے۔

(بقرہ ۳۸-۳۹)

اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ کیا واقعۃً یہی دوا ہے؟ تو میں یہ بانگ دہل اعلان کروں گا کہ یہی واحد اور حقیقی دوا ہے کیونکہ انسان کسی بھی چیز کے بارے میں نفع و نقصان کی خبر کر لینے کے بعد جو رویہ اپناتا ہے، کسی کام کو سبب دو ہوتے ہیں یا تو کسی امید اور لالچ پر وہ کوئی کام کرتا ہے یا کسی خوف اور ضرر کے اندیشے سے وہ باز رہتا ہے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جنت و جہنم کی شکل میں ان دونوں کا حل پیش کر دیا ہے یعنی اگر وہ اپنے او پر کنٹرول کرتا ہے اور صحیح روش اپناتا ہے تو اس کے لئے جنت جیسی بہترین نعمتوں سے پُر جگہ کا وعدہ ہے۔ جس کی امید اور لالچ پر انسان لامحالہ ضبط نفس سے کام لے گا یا اگر اپنے اوپر کنٹرول نہیں کرتا ہے بلکہ غلط روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے بھی ابدی اور تکلیفوں سے پُر جہنم کی وعید ہے جس کے ڈر اور خوف سے لامحالہ انسان اپنے جذبات و خواہشات پر لگام لگانے کی کوشش کرے گا اور جب ایسا ہوگا تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر غلط کام نہیں کرے گا۔

یہاں ایک بات اور کہہ دینے کی ہے کیونکہ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے بھی انسان غلط فہمی

کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر غلط روش اپنا لیتا ہے۔ وہ بھی واضح ہو جائے تو پھر انسان کے پاس کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔ وہ بات یہ ہے کہ عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس میں اس کو کوئی فائدہ ہی محسوس نہیں ہوتا ہے بلکہ وقتی طور پر اسے کچھ سرور ملتا ہے اور کچھ نفع بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہے لہٰذا اسے معیوب نہیں ہونا چاہیئے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی وقتی چیز دائمی چیز کے مقابلہ میں بہتر ہو سکتی ہے گرچہ وقتی چیز کچھ اچھی اور دائمی چیز اس سے کمتر ہو جبکہ یہاں تو صورت واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی وقتی چیز کے مقابلے میں آخرت کی چیزیں بدرجہا بہتر ہیں حتی کہ اس کی بہتری کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے چنانچہ اگر آپ انسانی کوششوں پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالیں تو آپ کو ہر جگہ ایک اصول نظر آئیگا بلکہ یہ بات ایک فطری قانون کی حیثیت رکھتی ہے کہ انسان بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب کہ وہ اس کی خاطر اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کرے اور کوئی بڑی خوشی اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ وہ اس کی خاطر اس سے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک فاتح اور کشور کشا اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ کل حکمرانی کرے۔ ایک بچہ ۲۵ - ۳۰ سال تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتیں برداشت کرتا ہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو لوگ سرمایہ تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے ہیں تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لائیں اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا جس طرح انسان اپنے دنیوی معاملات میں اس اصول کو برت کر کامیاب ہوتا ہے اور راحت و سکون حاصل کرتا ہے کیا اسے جنت جیسی چیز حاصل کرنے کے لئے نہیں برتنا چاہئے یا بغیر اسے برتے ہی اسے جنت مل جائیگی۔ ہرگز نہیں، جس طرح دنیا میں بڑی خوشی حاصل کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی قربانی دینا ہے اسی طرح جنت کے حصول کے لئے دنیا کے حقیر اور وقتی فائدے کی قربانی دینی چاہئے۔ بلکہ دینی ضرورت ہے۔ جس طرح چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی قربانی کے بغیر

بڑی خوشی کا حصول محال ہے، اسی طرح دنیا کی حقیر اور وقتی خوشیوں کی قربانی کے بغیر جنت کی خوشی کا حصول ناممکن ہے۔ اور اسی قربانی کو شریعت کی اصطلاح میں "صبر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دنیا کی عارضی خوشیوں اور مسرتوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں اعمال صالحہ کی انجام دہی اور جرائم سے اجتناب کی معمولی تکلیفوں کو برداشت تاکہ وہاں کی بڑی تکلیفوں سے نجات ملے اسی لئے قرآن میں آیا ہے۔

وجزاهم بما صبروا — اور ان کے صبر کے بدلے میں انھیں جنت

جنة وحريرا (دهر ۱۲) — اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ گرچہ کچھ سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور نفع حاصل ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی یہ چیز ایسی نہیں کہ اس پر اس ہمیشہ رہنے والی اور دائمی خوشی اور لذت و سرور کو ترجیح دیا جائے۔ بلکہ عقلمندی اور ہوش مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ بڑے منافع کے لئے چھوٹی چھوٹی منفعتوں کو قربان کریں اور دائمی خوشی کے حصول کے لئے وقتی خواہشوں کو بھینٹ چڑھا دیں۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عقلمند اس سے گریزاں ہوگا لہٰذا وہ بہانہ جو انسان اپنے اس عمل کے لئے تلاش کرتا ہے کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہے نہ ہمارے نزدیک اور نہ ہی اللہ کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کی رعایت نہیں کرتے وہ دنیا میں بھی گھاٹے میں رہتے ہیں اور کبھی معراج کمال تک نہیں پہنچتے اور آخرت میں بھی کہیں کے نہ ہوں گے اور ان کی ایک نہ سنی جائے گی۔ جیسا کہ قرآن مجید کے اندر سورۂ قیامہ میں آیا ہے کہ جب کفار و مشرکین اللہ کے حضور اپنی معذرتیں پیش کریں گے تو اللہ تعالیٰ اسے رد کر دے گا، اور انھیں جھڑکتے اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہے گا۔ كَلَّا بل تحبون العاجلة وتذرون الآخرة۔

یعنی ہرگز نہیں بلکہ تمہاری روش تو یہی تھی کہ تم موجودہ چیزوں سے محبت کرتے تھے اور آئندہ آنے والی چیزوں کو چھوڑ دیتے تھے یعنی دنیا سے محبت کرتے تھے اور آخرت کو چھوڑ دیتے تھے نظر انداز کر دیتے تھے۔ لہٰذا تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے بلکہ تم اپنی روش کی وجہ سے قابل گرفت و مواخذہ ہو اور پھر آگے ان کی سزا کا ذکر ہے۔

اس پوری گفتگو سے صاف واضح ہے کہ انسان دنیا کی تمام مخلوقات سے ایک منفرد مخلوق ہے جسے صحیح و غلط کی تمیز کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے اس وجہ سے وہ اپنے تمام اعمال کے سلسلے میں جوابدہ ہے اور اسی کے ذریعے وہ آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ اللہ نے اپنی عنایت سے وہ طریقے بھی بتا دیئے ہیں جن کے ذریعے انسان باحسن طریق اس سے پار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑے اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں کامیاب و بامراد بنا سکتی ہے۔ اللہ ہمیں علم و عمل اور صبر کی ارزانی کرے۔ آمین

بقیہ: ابن حزم حیات اور شاعری

(۴) محمد ثابت الفندی : دائرۃ المعارف الاسلامیۃ
المجلد الاول (تعریب) ۱۹۳۸ م

(۵) ابن حزم : الفصل فی الملل والاہواء والنحل
مکتبۃ خیاط۔ شارع بلس بیروت
(لبنان)

(۶) محمد ابو زہرۃ : ابن حزم، حیاتہ و آثارہ

(۷) الذہبی : تذکرۃ الحفاظ۔ حیدرآباد، دکن

(۸) ابن القفطی : تاریخ الحکماء طبع Lipper

(۹) B. Lewis : The Enclopaedia of Islam
Luzeic and CO London. V. III-1971 A.D.

(۱۰) دائرۃ معارف اسلامیۃ اردو۔ لاہور پاکستان ۱۹۶۲ م

ابن حزم حیات اور شاعری

محمد حسن حبیب فلاحی علیگڈھ

ولادت اور بچپن

ابن حزم چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور ادیب، شاعر اور فقیہ ہیں۔ آپ کی پیدائش ۳۰ رمضان المبارک ۳۸۴ھ ہجری بمطابق ۷ نومبر ۹۹۴ء عیسوی قرطبہ میں ہوئی۔ B. Lewis کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ابن حزم کا پورا نام ابو محمد بن علی بن احمد بن سعید بن حزم مذکور ہے[1] ان کی تاریخ ولادت کے سلسلہ میں سوانح نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک قول ۳۸۳ھ ہجری اور دوسرا ۳۱۹ھ ہجری کا ہے لیکن اول الذکر تاریخ مرجح ہے جس کو اکثر مورخین نے لیا ہے۔

ابن حزم نے خوش حال گھرانے اور معزز خاندان میں آنکھیں کھولیں اس لئے فطری طور پر انہیں بچپن ہی سے تعلیم و تربیت کا اچھا موقع ملا۔ دربار کی فضا

۱ـ The Encyclopaedia of Islam, B. Lewis
Luzac & Co. London, V-III-P. 790-(1971) AD.

نشوونما پانے کے سبب اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بڑی آسانی سے حاصل کی۔ آپ نے مختلف
اساتذہ کرام سے الگ الگ علوم کا درس لیا۔ آپ کے اساتذہ میں عبدالرحمان بن محمد بن ابی
زید الازدی کا نام بہت مشہور ہے جو اندلس کی خانہ جنگی کے دوران اندلس چھوڑ کر مصر چلے گئے
تھے۔ دیگر اساتذہ میں احمد بن جسور (متوفی ۴۰۱ھ ہجری) سرفہرست ہیں جن سے آپ
نے کافی کسب فیض کیا۔ علم حدیث کے حصول کی خاطر متعدد اصحاب کے پاس زانوئے تلمذ کیا۔
تعلیم اور مطالعہ کا شوق اس قدر تھا کہ مخالفین کی اذیتوں سے بچنے کے لیے جب وہ اپنے
گاؤں منت لیشم (Manta Lisham) میں گوشہ نشین تھے اس
وقت بھی مطالعہ میں غرق رہتے تھے۔

شخصیت ایک نظر میں

ابن حزم گوناں گوں صفات اور بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک طرف
فقیہ اور مورخ بھی تھے دوسری طرف ادیب اور شاعر بھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
لکھتا ہے

"...... Andalusian poet, historian, jurist, philosopher and theologian, one of the greatest thinkers of Arab-Muslim civilization ......"[1]

ان کے وسعت مطالعہ اور علوم کی جامعیت کا یہ عالم تھا کہ فلسفہ، تاریخ، اخبار،
انساب، لغت وادب، اشعار، جدید وقدیم اور حدیث وفقہ پر ایک ساتھ گہری نظر رکھتے
تھے۔ انہوں نے اندلس کے قرب وجوار میں رہنے والے یہود ونصاریٰ کے اعتراضات
کے جوابات بھی دیئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس وقت کے دیگر مذاہب اور ادیان

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۳ ص ۷۹۰

باطلہ نیز اسلام میں پیدا ہونے مختلف فرقوں اور گروہوں کے سلسلہ میں پوری معلومات رکھتے
تھے ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی اور جنگجو بھی تھے۔ انہیں کہیں
ہم زبان وقلم کی قوت کے ذریعہ نظریاتی تحریکات اور اپنے مخالفین کا مقابلہ کرتے
ہوئے دیکھتے ہیں تو کہیں جنگ میں ایک مجاہد کی طرح تلوار کے جوہر دکھاتے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ بلنسیہ میں المرتضیٰ کی خلافت تسلیم کرنے کے بعد جب ابن حزم واپس گئے تو وہ
وزارت کی ذمہ داری سنبھالی تو بنفس نفیس سپاہ میں شامل ہو کر لڑے اور قید کر لیے گئے۔ پھر
چند مہینوں کی قید وبند کی زندگی گزارنے کے بعد رہا کر دیے گئے۔ چھ سال بعد دوبارہ قرطبہ چلے گئے
اور مشہور عالم دین عبدالرحمن الخامس المستظہر کے وزیر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا لیکن ابھی چند
ہفتے بھی نہ گذرے تھے کہ بغاوت ہوگئی۔ عبدالرحمان الخامس کو قتل کر دیا گیا اور وزیر ابن
حزم کو ایک بار پھر قید خانہ کا منہ دیکھنا پڑا۔

ادب اور اسلوب تحریر

ابن حزم کی نمایاں خصوصیات میں ان کا ادب اور اسلوب تحریر سب سے ممتاز نظر آتا
ہے۔ آپ ادبی اسی خوبی کی بدولت تحریری اور جذباتی پر بھی سبقت لے جا چکے ہیں۔ اس کی زندہ
مثال آپ کی مشہور زمانہ تصنیف "طوق الحمامۃ فی الالفۃ والالاف" ہے جس کے مطالعے سے تحریر کی
عبارت آرائی بھی بڑی حد تک ماند پڑتی دکھائی دیتی ہے اور ایک قاری دونوں کے درمیان کافی
فرق محسوس کرتا ہے۔

ابن حزم کی یہ کتاب پہلی بار ۱۳۳۲ھ ہجری میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی عبارتوں میں
ابن حزم کی ایک اور شکل واضح دکھائی دیتی ہے اور وہ ماہر نفسیات کی شکل ہے۔ ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ ان کو مزاج شناسی کا ملکہ حاصل تھا۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے دائرۃ المعارف
لکھتا ہے:

"ابن حزم کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی اور وہ ایک ذہین اور صاحب طرز

انشا پرداز اور دلکش شاعر تھا۔ اس کتاب میں ہمیں نہ صرف اس کے اپنے کردار کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ اس نے اپنے زمانہ کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر بھی بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے جس کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں"

ابن حزم کا انداز تحریر طوالت میں کسی قدر ابن خلدون کے طرز تحریر سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ بیشتر جملے کافی لمبے لمبے ہوتے ہیں اور کئی کئی سطروں کے بعد مبتدا کی خبر آتی ہے۔ جس سے عام طالب علم کے لئے پیچیدگی کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلاست و روانی کہیں ختم نہیں ہوتی۔

ابن حزم ۔ معاصرین کی نظر میں

جب ہم ابن حزم کو ان کے مخالفین کے اقوال کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بہت زیادہ دوری اور چشمک تھی۔ ان کے مخالفین اور معاصر فقہا نے ان کے خلاف مخالفت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے ابن حزم کی فکری اور علمی کاوشوں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ موقع ملنے پر انہیں نذر آتش کر دیا کرتے تھے۔ اس رد عمل کی خاص وجہ علامہ ابن حزم کی مزاج کی درشتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہ تلخی بھی مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے سبب پیدا ہوئی ہو لیکن انہوں نے دوسروں کی تردید اور کسی کی رائے پر تبصرہ کا جو رویہ اختیار کیا تھا وہ نامناسب تھا ان کی باتیں تیر کی طرح دلوں میں جا لگتی تھیں جس سے وہ تلملا اٹھتے اور ایک زخم خوردہ شیر کی طرح مد مقابل پر پوری قوت کے ساتھ ٹوٹ پڑتے تھے۔ ابن حزم کی وفات کے بعد جتنی کتابیں ان کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جن میں ان کے نظریات پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ان کے نظریاتی مخالفین میں عبدالحق بن عبداللہ اور ابن زرقون میدان میں آئے۔ انہوں نے کتاب "المحلی" کے جواب میں کتاب المعلی لکھی جس میں ان کے

نظریات پر تنقید کی گئی ہے۔

دوسری طرف قاضی ابن العربی (پانچویں صدی ہجری کا نصف) اور ابن زرقون کے شاگرد اور مشہور ماہر نباتیات ابن الرومیہ وغیرہ نے کھل کر ابن حزم کی حمایت کی۔ ابن الرومیہ نے "المعلی" ہی کے نام سے تیسری کتاب ان کی حمایت میں لکھی۔

عقیدہ و مسلک

ابن حزم کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ پہلے شافعی المسلک تھے لیکن وفات سے چند سال قبل ظاہری فرقہ سے جا ملے تھے۔ اس کی تائید و حمایت میں رسالے لکھے اور آخری دم تک اسی کی طرف داری کرتے رہے۔ افکار و مسلک کی یہ تبدیلی [illegible] میں واقع ہوئی جب ان کی کتاب "جمہرۃ الانساب" منظر شہود پر آئی۔ یہ کتاب عرب اور اندلس کے عرب اور بربر خاندانوں کے انساب پر لکھی گئی ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ بات بھی یہاں قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ ابن حزم کے استاذ ابو الخیار مسعود بن سلیمان بن مفلت جو ظاہری تھے انہیں سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنا مسلک بدل لیا تھا۔

"...... who codified the Zahiri doctrine and applied its methods to all the Kuranic sciences." [1]

ابن حزم تقلید کے سخت مخالف تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کے قول و فعل کو نہ صرف یہ کہ قابل عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ حرام گردانتے تھے۔ ایک بار کسی کے پوچھنے پر انہوں نے کہا "لا حجۃ فی قول احد بعد رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] Encyclopaedia of Islam, B. Lewis
V— III Page · No—790

"عقیدہ و مسلک" اپنے مسلک میں اس قدر سخت تھے کہ معمولی اختلاف کو بھی برداشت نہیں کرتے اور فوراً کذب کا فتویٰ صادر کر دیتے۔ ایک بار امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی قول ان کو ظاہر حدیث سے مختلف نظر آیا اور انہوں نے بلا تامل کہہ دیا "صدق رسول اللہ وکذب مالک"

معاصرین کا رویہ اور اس کے اسباب

جب ہم معاصرین کے اس معاندانہ رویہ کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ابن حزم کا اپنے عقیدہ و مسلک میں سخت ہونا بھی اس کا ایک اہم سبب معلوم ہوتا ہے وہ اس معاملہ میں دوسروں سے نرمی کا برتاؤ قطعی ناروا سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی عیش و عشرت کی زندگی، ان کی مزاج کی درشتی اور ہر معاملہ میں انتہا پسندی بھی ان وجوہات میں سے چند ہیں۔ ان ساری وجوہات کی بنا پر ان کے خلاف باضابطہ ایک محاذ بن گیا تھا جو آئے دن مضبوط ہوتا چلا گیا۔

مشہور مورخ اور سوانح نگار پروفیسر محمد ابوزہرہ نے کسی ایک سبب پر زور دینے کی بجائے منجملہ جن امور کا تذکرہ کیا ہے ان میں ابن حزم کی ترش مزاجی، بے لوچ جوابی جوابی حملہ اور کسی قدر معاشی خوش حالی اور احساس برتری قابل ذکر ہیں۔

تصنیف و تالیف

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ابن حزم بھی کثیر التعداد کتابوں کے مصنف تھے۔ بروکلمان نے سیوطی کی جو کم سے کم تعداد بتائی ہے وہ ۵۱۵ ہیں اور اعلام کے مطابق رسالوں کو شامل کر کے یہ تعداد چھ سو تک پہونچتی ہے۔ علامہ ابن حزم کی تصنیفات کی تعداد بھی ۴۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ خود ان کے بیٹے ابو رافع نے لکھا ہے کہ جملہ تصنیفات کی تعداد چار سو ہے جو کم و بیش اسی ہزار (۸۰۰۰۰) اوراق پر مشتمل ہے۔ ان کی چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں۔

(۱) طوق الحمامہ۔ یہ ادب میں ابن حزم کی سب سے مشہور کتاب ہے جو پہلی بار ۱۳۰۳ ہجری میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب مختلف ابواب کے تحت چھوٹے چھوٹے واقعات و مشاہدات اور کہانیوں نیز اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر ہر واقعہ سے متعلق خواہ وہ ان کے اپنے مشاہدہ میں آیا ہو یا ان کے معاصرین میں سے کسی ثقہ نے ان سے بیان کیا ہو مناسب اشعار لا کر کتاب میں چاشنی پیدا کر دی ہے جس سے کوئی بھی باذوق طالب علم لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کتاب کے دو انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تو A.R. Nykl نے کیا ہے جو پیرس سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا اور دوسرا ترجمہ پروفیسر آربری کا ہے۔ اس کے علاوہ روسی، فرانسیسی اور جرمنی میں بھی اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) کتاب الاحکام فی اصول الاحکام۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۳) کتاب المحلی بالآثار شرح المجلی بالاقتصار۔ یہ گیارہ جلدوں پر مشتمل اہم ترین کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے ظاہری نظام فقہ کو سمویا ہے اور اس کی تائید میں دلائل فراہم کئے ہیں۔

(۴) کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل۔ اس کتاب میں انہوں نے اسلام کے مذہبی فرقوں خصوصاً اشاعرہ اور صفات الٰہیہ کے بارے میں ان کے خیالات پر قدغن لگایا ہے۔

(۵) ابطال القیاس والرای والاستحسان والتقلید والتعلیل۔ اس کے اندر انہوں نے اپنے نظریہ کی پرزور حمایت اور معاصرین پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ ان کے علاوہ چند کتابیں یہ ہیں۔

(۶) رسالۃ فی المفاضلۃ بین الصحابہ (۷) النبذۃ الکافیۃ فی اصول احکام الدین (۸) امہات الخلفاء (۹) فضائل الاندلس (۱۰) مراتب العلوم (۱۱) جوامع

السیرۃ (۲) حجۃ الوداع اور (۳) جمہرۃ الانساب ۔ وغیرہ ۔

مختصر یہ کہ ابن حزم ایک فقیہ، محدث، مؤرخ اور ماہر دینیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند مقام ادیب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے جو بیک وقت کئی علوم پر کافی گہری نظر رکھتے تھے۔ اگر انہوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کیا ہوتا جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے اور آخری ایام میں اپنا مسلک تبدیل نہ کیا ہوتا تو آج ان کا مقام اس سے کہیں بلند ہوتا جہاں وہ اس وقت نظر آتے ہیں۔

وفات

علامہ ابن حزم کا انتقال ۲۸ شعبان المعظم سنہ ۴۵۶ ہجری بمطابق ۱۵ اگست سنہ ۱۰۶۴ عیسوی کو منت لیشم ([illegible]) میں ہوا۔ اس طرح کل ملا کر بہتر ۷۲ سال کی عمر پائی۔

المصادر

(۱) یاقوت الحموی : کتاب ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب المعروف بـ "معجم الادباء" الجزء الخامس مطبعۃ ہندیۃ الموسکی بمصر۔

(۲) الدکتور احسان عباس : تاریخ الادب الاندلسی دار الثقافۃ بیروت لبنان ط ۱۹۸۵ م

(۳) عبد السلام علی : الأعلام المجلد الرابع ۔ دار العلم للملایین بیروت ۔ لبنان ۱۹۸۰ م

(بقیہ : صفحہ ۳۶ پر)

★ عبدالمجید فیضی بستوی

مدرسہ انوار العلوم ڈوڈھوا کوہنہ ـــ گونڈہ

ہماری شادیاں

اسلام فطری اور خدائی دین ہے کسی انسان کا وضع کردہ یا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس میں دینی و دنیاوی، معاشی ہر قسم کی ہدایت موجود ہے۔ اس کے اصول و ضوابط محکم ہیں، اس میں کسی کو اختیار نہیں ہے کہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کمی بیشی، رد و بدل، کاٹ چھانٹ کرتا رہے۔ اسی خدائی دین (اسلام) کے ماننے والے کو مسلمان کہتے ہیں۔

آج اسلام کا ماننے والا، کلمۂ توحید کا اقرار کرنے والا، اور خدا اور رسول کی محبت کا دم بھرنے والا، زندگی کے ہر موڑ اور دیگر معاشی اور معاشرتی معاملے میں اسلامی اصول کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ماحول و معاشرے، رسوم و رواج کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ خدا کے متعین کردہ فرائض و احکامات کو اپنی مقصد برآری کے لئے خود ساختہ طریقے کے موافق بنانے کے لئے رکیک و بے جا تاویلیں کرتا ہے۔ دولت کے خداؤں اور ارباب منصب و جاہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے احکم الحاکمین سے عداوت کرتا ہے۔ وضع قطع، تہذیب و تمدن میں اسوۂ رسول کی پیروی کو باعث شرم و عار سمجھتا ہے۔ متبعین سنت کو طرح طرح کے القاب سے ملقب کرتا ہے۔

آج مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کی وضع قطع کو اپنایا، رسم و رواج کے ادا کرنے میں ان کو شرما دیا۔ مثال کے طور پر آپ شادی کو لے لیجئے مسلمانوں میں وہی طریقہ رائج ہے جو ہندوؤں کے یہاں ہے۔ تلک، جہیز، ناچ گانا، اسراف و تبذیر میں بھی ان سے پیچھے نہیں۔ ایک شادی

اسی کو سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں جہیز کے نام پر زر و دولت کا خزانہ دیا گیا ہو، ماکولات و مشروبات میں حلال و حرام کی تمیز مٹا دی گئی ہو، ہزاروں روپے خرچ کر کے مطبوعہ و مرصع دعوت نامے تقسیم کئے گئے ہوں، قمقموں اور جھنڈیوں سے سڑکوں اور گلیوں کو سجایا گیا ہو، غیر مباح چیزوں کو مباح کر دیا گیا ہو،

شارع علیہ السلام فرماتے ہیں کہ سب سے بہترین و بابرکت شادی وہ ہے جس میں خرچ کم ہو۔ عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان اعظم النكاح بركة ايسره مؤنة (مشکوٰۃ ص)

ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ برکت ایسی عورتوں میں ہوتی ہے جن کے نکاح میں زیادہ خرچ نہ کرنا پڑے (مسند احمد حاکم)

ہمیں نبیؐ اور خلفاء راشدین کے عہد مبارک کی شادیوں سے درس عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ کس سادگی سے نکاح ہوا کرتے تھے، نہ جہیز سامانوں کی شرط تھی نہ زر و جواہرات کا، نہ زیورات کی شرط تھی نہ کپڑوں اور جوڑوں کی، نہ مطبوعہ و مرصع دعوت نامے تقسیم کئے جاتے تھے۔ نہ شہنائی بجتی تھی نہ پٹاخے چھوڑے جاتے تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ شادی کر لیتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خبر نہیں دیتے تھے۔ جب آپ کپڑوں پر زردی کا نشان دیکھتے ہیں تو پوچھتے ہیں یہ کیا ہے؟ صحابی رسول عبدالرحمنؓ جواباً فرماتے ہیں کہ اے اللہ کے نبیؐ میں نے ایک عورت سے شادی کر لی ہے۔ عن انس ان النبي صلى الله عليه وسلم راى على عبد الرحمن بن عوف اثر صفرة فقال ما هذا قال اني تزوجت امراة على وزن نواة من ذهب قال بارك الله لك اولم ولو بشاة (متفق علیہ)

عبدالرحمن بن عوف کے پاس مال و زر کی کمی نہیں تھی، مگر انھوں نے نہ مطبوعہ و مرصع دعوت نامے کئے اور نہ آتش بازی ہوائی، یہاں تک کہ نبی کریمؐ کو بھی شادی کی اطلاع نہیں دی۔ آپ نے کپڑے پر زردی کے نشان دیکھ کر پوچھا کیا ہے ان کے

جواب میں کہا کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ پھر آپ نے ولیمہ کا حکم فرمایا۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا سقت الیہا کتنی مہر دی ہے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا

زنة نواة من ذهب کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا (بخاری ش)

آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ شادی میں مجھکو مدعو کیوں نہیں کیا؟ جہیز میں کیا ملا؟ نقد کتنا، جنس کتنا؟ دولہن میکے سے کیا لائی؟ بلکہ آپ نے یہ پوچھا کہ "کیا دیا ہے"

کاش! دور حاضر کے مسلمان نبیؐ کے اس طرز گفتگو اور اسوہ صحابہ پر عمل کر کے بڑھوں کے اہتمام، سامانوں کی فراہمی، شب و روز کی دوڑ دھوپ، سالہا سال کی کمائی اور محنت کے ہزاروں لاکھوں روپے برباد کرنے سے بچ جاتے۔

کاش! دور حاضر کے مسلمان نبیؐ کے اس طرز گفتگو اور اسوہ صحابہ پر عمل کر کے بڑھوں کے اہتمام سامانوں کی فراہمی، شب و روز کی دوڑ دھوپ، سالہا سال کی کمائی اور محنت سے ہزاروں لاکھوں روپے برباد کرنے سے بچ جاتے۔ آج ہمارا سوال یہ ہوتا ہے کہ سسرال سے کیا لایا، نقد جنس کتنا، جہیز میں کون کون سی چیزیں ملیں، اور یہ پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ مہر کیا ہے یا نہیں، اگر حسب منشا جہیز میں تمام مطلوبہ چیزیں ملیں ہیں تو خیر ورنہ لڑکی کے والدین پر طرح طرح کے طعن و تشنیع اور لڑکی پر ظلم کیا جاتا ہے ایسا تکلیف دہ برتاؤ، اور ایسی ناروا حرکتیں کی جاتی ہیں کہ خدا کی پناہ!

کیا اسلام میں ان رسوم و رواج کا جواز موجود ہے؟ قرآن و سنت میں اس قسم کا کوئی حکم پایا جاتا ہے؟ خلفاء راشدین کے عہد خلافت میں ایسا ہوا ہے؟ جن کی اتباع کو ہمارا لازم قرار دیا گیا ہے: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين۔

اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر قرآن کے حکموں پر کیوں نہیں چلتے: لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ کیا نبی کریمؐ کا وہ نمونہ عمل کرنے کے لئے کافی ہے؟ کیا نبیؐ نے شادی نہیں کی تھی؟ صحابہ کرام کی زندگی اس صفت سے خالی تھی؟ اگر شادی کی تھی تو کس طرح؟ دور حاضر کے مسلمانوں

یہ مروجہ رسوم کے مطابق یا سنت نبوی کے مطابق۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ شادیاں کیں لیکن منگنی، جہیز کی فہرست بنائی نہ لمبا چوڑا پروگرام بنایا، حکم خداوندی کے مطابق شادیاں کیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی ان خرافات سے کوسوں دور تھی، آپ کے قول و فعل کے مطابق کہ ذوالنعل بالنعل عمل کیا یہاں تک کہ آپ کے حکم کی مخالفت کرنے والے پر تلوار کھینچ لی، گردن مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔

ہمیں زندگی کے تمام امور میں نبی کریم ؐ کے اسوہ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے چاہے وہ امور دنیاوی ہوں یا آخرت سے متعلق۔ بہرحال ہمیں مسلمان ہونے کے ناطے ہر ہر قدم پر اسوہ رسول ہی کو دیکھنا ہوگا، اسی کو اپنانا ہوگا، اسی کے مطابق اپنے قدم کو اٹھانا ہوگا، طریقۂ نبوی کو حرزِ جاں بنانا ہوگا ورنہ " ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً " (اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا کھلی ہوئی گمراہی کا شکار ہے) کی زد سے ہم نہیں بچ سکتے۔

شادی کے بارے میں جو پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، شب و روز دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے، در در دریوزہ گروں کی طرح بھٹکنا پڑتا ہے، مجبوراً کھیت و جائداد بیچنی اور رہن رکھنی پڑتی ہے، لڑکوں کو دستی عمر تک بٹھانا پڑتا ہے، یہ تمام دشواریاں اور پریشانیاں ہماری ہاتھوں کی کمائی ہیں۔

وما اصابکم من مصیبة فبما (اور احکام خدا اور فرمان نبوی کی مخالفت
کسبت ایدیکم کا نتیجہ ہیں۔

ہمارے یہاں سب سے زیادہ بدتر اور غلیظ رسم یہ ہے کہ شادی کے وقت دولہا کو لڑکی والے گھر میں جاتے ہیں، رشتے ناطے، کنبے قبیلے کی محرم، غیر محرم عورتیں، نوجوان لڑکیاں چست و تنگ لباس پہن کر، زینت کی تمام چیزوں سے مزین ہو کر دولہے کے اردگرد جمع ہوتی ہیں، حیا سوز و غیرت کو شرما دینے والا مذاق کرتی ہیں، اپنے ہاتھوں سے مٹھائی پان زبردستی نوشہ کے منہ میں ڈالتی ہیں، سر پہ بتاشہ اور پیسہ لٹاتی ہیں، منچلے دوپٹے کسی کا دوپٹہ کھینچ لیتے ہیں، تو کسی کی ساڑی، یہ نا شائستہ حرکتیں کون کر رہا ہے؟ کس کے گھروں میں یہ سب ہو رہا ہے؟

کتاب کفر و دجل تا مر خدا بود زبان ✿ یہ بدعت ہے تو الحذر یہ بھی ہے تو الاماں

کیا عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں عورتیں نہیں تھیں؟ حسن و خوبصورتی سے عاری تھیں؟ کپڑے اور جوڑے نہیں تھے؟ سب کچھ تھا مگر ان کے دلوں میں اللہ کا خوف تھا، منکرات کے قریب جانا پسند نہیں کرتی تھیں، غیر محرم کی نگاہ پڑ جائے یہ ان کی غیرت کو گوارہ نہ تھا، وقرن فی بیوتکن (اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) پر عمل تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید "جو عورت مردوں کے سامنے سے بناؤ سنگار کرکے، عطر و خوشبو میں ملوث ہو کر گذر جائے زانیہ ہے" مد نظر تھی۔

دور حاضرہ کی عورتوں کی طرح مشرکوں، یہودیوں کی محفلوں اور مجلسوں کی زینت بننے کے بجائے وہ گھروں کی زینت بنتی تھیں، ضرورت کے وقت چادروں میں لپٹ کر باہر نکلتی تھیں، اس لئے کہ ان کو پردہ کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد باری ہے کہ "مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو ظاہر ہے، اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنی زینت کو کسی پر ظاہر ہونے نہ دیا کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا اپنے غلاموں کے یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کی پردے کی باتوں سے مطلع نہیں اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے" (سورہ نور)

زمانۂ جاہلیت میں عورتیں اپنے سینوں پر کچھ نہیں ڈالتی تھیں، گردن، بال، چوٹی

بالیاں صاف نظر آتی تھیں، زمین پر پاؤں کو زور سے مار کر چلتی تھیں تاکہ پیر کا زیور بجے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو اس سے روک دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچانک نظر پڑ جائے تو معاف، قصداً بار بار دیکھنا منع ہے۔ ازواج مطہرات تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں مگر آپ نے سختی سے پردہ کا حکم دیا۔ ایک دفعہ ایک نابینا صحابی عبداللہ ابن مکتوم مسجد نبوی میں تشریف لائے، حضرت ام سلمہؓ و میمونہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے پردہ کا حکم دیا تو حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول یہ تو اندھے آدمی ہیں ہم ان سے کیا پردہ کریں، آپ نے فرمایا تم دونوں اندھی نہیں ہو۔

(احمد ترمذی ابو داؤد)

کاش! ملت اسلامیہ کی بیٹیاں اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں، اپنی لیست کو سدھارنے کی کوشش کریں اور اس ہدایت کو اپنا کر اپنی زندگی کو راہ راست پر لائیں۔

مذکورہ رسوم و رواج کا جائزہ ہمیں کتاب و سنت کی روشنی میں لینا چاہیے کہ جو رسم کر رہے ہیں کیا وہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس سے بچنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وساءت مصيرا

(سورۃ النساء)

ہدایت واضح ہو جانے کے بعد جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور مومنوں کی راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرے گا اسے اس طرف لگا دیں گے پھر اسے جہنم میں داخل کریں گے۔ اور جہنم برا ٹھکانہ ہے۔

ہمارے لئے عافیت اور بچاؤ اسی میں ہے کہ ہم صحابہ کرام کے راستہ کو اپنائیں ان سے بڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا جان و مال کی بازی لگانے والا کوئی نہیں تھا، جو کچھ ہم کر رہے ہیں اگر ان لوگوں نے کیا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہمارے لئے ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

انتخاب خادمان جمعیت

طلبہ کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور انہیں عملی تربیت دینے کے لئے ان کی ایک جمعیت جمعیۃ الطلبہ کے نام سے قائم ہے ابھی اس کے ذمہ داران کا انتخاب عمل میں آیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔	سکریٹری جمعیت	جاوید سلطان	(اعظم گڑھ)
۲۔	معتمد طعام	محمد جمال	(سنبھل)
۳۔	معتمد لائبریری	محمد ادریس	(نیپال)
۴۔	معتمد اخبارات و رسائل	افروز عالم	(پورنیہ)
۵۔	" کھیل	محمد الیاس	(نیپال)
۶۔	" اخبانی	آفتاب رحمانی	(دربھنگہ)
۷۔	" اسٹور	منظر عالم	(چمپارن)
۸۔	" خدمت خلق	نظر الحسن	(نیپال)
۹۔	" شعبہ صفائی	اسعد ادریس	(اعظم گڑھ)
۱۰۔	" شعبہ اردو تحریر و تقریر عربی ششم و ہفتم	امان اللہ فہد	(گونڈہ)
۱۱۔	" شعبہ اردو تحریر و تقریر عربی پنجم	شمشاد حسین	(بجنور)
۱۲۔	" " " " " چہارم	امتیاز احمد	(مالیگاؤں)

۱۳-	معتمد شعبہ اردو تقریر و تحریر عربی سوم ،	اکرام الرحمان	(دربھنگہ)
۱۴-	" " " " " دوم	محمد الیاس	(آکولہ)
۱۵-	" " " " " اول	مظہر حسین	(ہزاری باغ)
۱۶-	معتمد شعبہ اردو تحریر و تقریر ثانوی درجات	عرفان احمد	(اعظم گڑھ)
۱۷-	نائب " " " "	عبد العلیم	(بستی)
۱۸-	معتمد شعبہ انگریزی عربی پنجم تا عربی ہفتم ،	ملک وسیم احمد	(بستی)
۱۹-	" " " عربی اول تا چہارم ،	لیاقت علی	(بمبئی)
۲۰-	" " عربی پنجم تا عربی ہفتم	عبد الرب اثری	(دربھنگہ)
۲۱-	" " " عربی اول تا عربی چہارم	صداقت حسین	(ہزاری باغ)

چھپتے چھپتے :- یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جامعہ کے سب سے قدیم اور بزرگ استاذ جناب مولوی محمد ادریس صاحب ایک عرصہ تک علیل رہنے کے بعد ۲۰ جون ۱۹۹۰ء بروز پیر ساڑھے دس بجے دن میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح جامعہ اپنے ایک فرض شناس اوقات کے پابند محنتی اور مستعد استاذ سے محروم ہو گیا۔ مرحوم جامعہ کے پڑوس جنگلی پور کے رہنے والے تھے۔ چند سال قبل جامعہ کی طرف سے سنگاپور کے دورے پر تشریف لے گئے۔ وہاں گرنے کی وجہ سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کمر میں کافی چوٹ آئی جس کی وجہ سے دوا کھاتے رہتے تھے۔ ابھی چند ماہ قبل دوبارہ کمر کی تکلیف میں شدت آ گئی اٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا اور اسی حالت میں موصوف اپنے رب سے جا ملے۔ خدا مرحوم کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

نماز جنازہ میں جامعہ کے طلبہ و اساتذہ کے ساتھ قرب و جوار کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ایک تعزیتی پروگرام میں اساتذہ نے انھیں پرنم آنکھوں سے

(بقیہ صفحہ ۶۵ پر)

لازمی نکاح رجسٹریشن بل مسلمانوں کیلئے قابل قبول نہیں

مولانا منت اللہ رحمانی

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے حکومت مغربی بنگال کو متنبہ کیا ہے کہ وہ لازمی نکاح رجسٹریشن کا قانون بنا کر شریعت میں مداخلت سے باز رہے۔ اس طرف اخبارات میں خبریں آ رہی ہیں کہ حکومت مغربی بنگال لازمی نکاح رجسٹریشن کے سلسلہ میں عنقریب ایک بل پیش کرنے والی ہے۔ اس مجوزہ بل کے خد و خال ابھی تک پوری طرح سامنے نہیں آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے بارے میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا رحمانی مدظلہ نے فرمایا کہ کسی صورت میں نکاح رجسٹریشن کو لازمی قرار دینا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ نے یہ بھی فرمایا کہ نومبر [illegible] میں حکومت یوپی نے بھی مرکزی حکومت سے درخواست کی تھی کہ ایک مرکزی نکاح رجسٹریشن ایکٹ بنایا جائے تاکہ پورے ملک میں ہونے والے نکاح کا اندراج اس ایکٹ کے تحت ہو سکے اور زوجین کے درمیان اختلاف کی صورت میں نکاح کی تفصیلات کا مکمل ریکارڈ موجود ہو۔ اس موقع پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ملک کے تمام دینی اداروں، علماء کرام اور مفتیان عظیم سے لازمی نکاح رجسٹریشن کے

سلسلہ میں رائے حاصل کی اور علماء کرام پر مشتمل ایک کمیٹی ان آراء کی روشنی میں ایک رپورٹ تیار کی تھی جو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس مدراس منعقدہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں پیش کی گئی اور بالاتفاق رائے درج ذیل تجویز منظور کی گئی جو بورڈ کا فیصلہ ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا یہ اجلاس نکاح رجسٹریشن سے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ قبول کرتا ہے اور مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں پر واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں رجسٹریشن کا لازم ہونا مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے بنیادی حق میں مداخلت کی ہی ایک شکل ہے، یہ اجلاس ملک کے تمام دینی اداروں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ نکاح رجسٹریشن کا خود انتظام کریں اور اس کا ایک قابل اعتماد ریکارڈ رکھیں تاکہ نکاح کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

حضرت مولانا رحمانی مدظلہ نے یہ بھی فرمایا کہ مغربی بنگال میں مجوزہ نکاح رجسٹریشن کے سلسلہ میں بننے والے قانون کو بھی بورڈ کے اس فیصلہ کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے۔

مورخہ ۱۷ر جولائی سنہ ۲۰۰۳ء محمد ضیاء الرحمن رحمانی آفس سکریٹری

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

● بقیہ: جامعہ کے لیل و نہار

ساتھ خراج تحسین پیش کیا اور دعائے مغفرت کی۔ محترم جناب مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب سابق ناظم جامعۃ الفلاح نے جب مرحوم کے انتقال کی خبر لی تو اپنا سر پکڑ لیا اور کچھ دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا کہ اب میرا کوئی کلاس فیلو نہیں رہ گیا۔ مرحوم مڈل اسکول میں مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کے کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔